تیری اک نگاہ کے اسیر ہیں

تحریر: نادیہ احمد

Urdu Novels Ghar

"اندر نہیں چلیں گے صاحب؟"بلند دروازے کے سیاہ محراب کی طرف بڑھتے اس نے سر اٹھا کر سامنے نظر آتی اس پر شکوہ اور بلند و بالا عمارت کو دیکھا جس کے لاتعداد دروازوں اور ان گنت جھروکوں سے جھانکتی انا اور سفاکی آج اتنے برسوں بعد بھی قائم و دائم تھی۔ گزرے ماہ و سال کا کوئی بھی خسارہ اس عفریت کی ہیبت کو کم نہیں کر پایا تھا۔ اس کے رکنے پہ ساتھ چلتا ملازم بھی احتراماً وہیں کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے ایک نظر فلک شیر کو دیکھا جس کی کنپٹیوں سے جھانکتی سفیدی اس کی وفاداری کی عمر کا پتا دے رہی تھی۔ ایک تلخ مسکراہٹ نے لبوں کا احاطہ کیا اور بناء کچھ کہے وہ گھر میں داخل ہو گیا۔ فلک شیر دروازے سے ہی واپس لوٹ گیا تھا کہ اس مقام سے آگے اس کے پر جلتے تھے۔

"میں صدقے، میں واری۔۔۔ برسوں بعد مجھ کرم جلی کو میرے چھوٹے شہزادے کا دیدار نصیب ہوا"۔ ہال میں داخل ہوتے ہی گھر کی پرانی ملازمہ قدسیہ نے اپنے مخصوص انداز میں اس کا استقبال کیا تھا۔

"میں تو سمجھی تھی جیتے جی شائد اب آپ سے ملنا نصیب ہی نا ہو"۔ اپنی آنکھوں کی نمی کو دوپٹے کے کونے سے صاف کرتے وہ مزید بولی تو اس نے آگے بڑھ کر مسکراتے ہوئے اسکے جھریوں بھرے چہرے کو اپنے ہاتھوں سے چھوتے تسلی دی تھی۔ قدسیہ کی عمر ساٹھ سے اوپر کی تھی۔ وہ اس گھر میں اس کی پیدائش کے وقت آئی تھی اور ہمیشہ سے ہی تبریز کے بہت قریب تھی۔

"بابا کیسے ہیں؟" وہ حد رجہ سنجیدہ تھا۔

"بستر پکڑ لیا سائیں نے تو میرے بچے۔ ایک ہفتہ ہو گیا۔ روز ڈاکٹر آتا نسخہ بدل کر یہ جا وہ جا۔" قدسیہ نے ایک گہرا سانس لیتے دکھی لہجے میں کہا ساتھ ہی میگھ ملہار سا رونا پھر شروع ہو گیا تھا۔

"کچھ بتایا نہیں انہیں ہوا کیا ہے"۔ اس نے بڑے ضبط سے کام لیتے سوال کیا تھا۔

"ارے میرا بچہ، ہم غلام ابن غلاموں کو بھلا کوئی کیا بتائے گا۔ تم آ گئے ہو تو خود ہی معلوم کر لو۔ میں نگوڑ ماری تو اٹھتے بیٹھتے اس گھر کی خوشیوں کی دعائیں کرتی ہوں۔ پتا نہیں کس کی منحوس نظر کھا گئی اس آشیانے کو۔" قدسیہ ماضی میں کھوئی جذباتی ہوئی تھی تو بے ساختہ اس کے اعصاب تناؤ کا شکار ہوئے تھے۔ وہ ماضی جس کی اذیت سے فرار کی خاطر وہ سالوں سے جلاوطنی کاٹ رہا تھا ان گزرے ہوئے لمحوں کا ذکر ہی اسے بوجھل و مضطرب کرنے کو کافی تھا۔ قدسیہ اپنے ہی دھیان میں مگن گزرے ہوئے واقعات دہرانے لگی۔ وہ لب کاٹے خاموش کھڑا اسے ٹوک بھی نہ پایا۔ اسی وقت ساتھ والے کمرے سے نکل کر ایک لڑکی ہال میں داخل ہوئی تھی۔ اجلی رنگت، سیاہ

آنکھیں۔۔۔۔۔بالوں کو چوٹی میں لپیٹے اس کا حلیہ بے حد عام سا تھا۔اسے قدسیہ کے ساتھ کمرے میں موجود پا کر وہ ایک پل کو ٹھٹکی۔آنکھوں میں ابھرتا تحیر چھپائے نا چھپتا تھا۔بس ایک لمحے اس کی آنکھوں میں جگنو ٹمٹمائے تھے پر اسے حیرت سے اپنی جانب متوجہ پا کر آن کی آن میں وہ دیئے بجھ گئے۔سر جھکائے وہ تیزی سے اس کے پاس سے گزر کر باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

"قدسیہ اماں۔۔۔یہ لڑکی؟؟؟؟"وہ اب تک حیرت میں ڈوبا اس پہیلی کو سلجھانے میں الجھ رہا تھا۔

"پہچانے نہیں؟؟؟؟؟بیوی ہے آپ کی۔۔۔۔۔۔۔۔"قدسیہ کی آواز اس کی سماعتوں پہ بم بن کر گری تھی۔وہ گنگ کھڑا رہ گیا۔زندگی سے دور،بے جان اور تھکا ہوا چہرہ اور وہ آنکھیں جو چیخ چیخ کر شکوہ کرتیں ایک ہی پل میں اسے پاتال میں دھکیل گئی تھیں۔وہ زبان سے ایک بھی لفظ کہہ نہیں پایا تھا۔

جواب نا پا کر قدسیہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی اس کے پیچھے باورچی خانے میں چلی گئی۔

☆☆☆

"ہائے اور با،لڑکی یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟" روزینہ بیگم نے اسے دیکھ کر ماتھا پیٹ لیا۔

"کیوں اچھی نہیں لگ رہی کیا؟" دیوار پہ لگے قدِ آدم آئینے میں اپنے عکس پہ نگاہیں جمائے صلہ نے خود پہ تنقیدی نگاہ ڈالی۔مکیش کے کام والا سرخ شیفون کا کرتا اور اسی کی ہم رنگ ڈھیروں سرخ کانچ کی ریشمی چوڑیوں سے

دونوں کلائیاں بھری ہوئی تھیں پر اماں نے جو دیکھ کر ناک بھوں چڑھائی تھیں وہ تھی اس کے لبوں پہ تہہ بہ تہہ جمی لال لپ اسٹک۔

"سسرال جا رہی ہو جو اتنا سنگھار کئے گھوم رہی ہو"۔اس کے سوال کا جواب دینے کی بجائے وہ تنک کر بولیں۔

"تو پھر آپ کیوں ایسا سنگھار نہیں کرتیں۔یہ سادہ سے حلیے میں بیٹھی سارا دن نوکروں پہ حکم چلاتی رہتی ہیں حالانکہ آپ تو برسوں سے سسرال میں ہی بیٹھی ہیں"۔شرارت سے نچلا لب دبائے اس نے اماں کو چھیڑا تو وہ قدرے جھینپ سی گئیں۔ناک سے مکھی اڑانے کے انداز میں ہاتھ مارتے بولیں

"ارے ہٹو۔۔۔اب میری کون سی عمر ہے ان چونچلوں کی بھلا"۔صلہ نے بے اختیار لاڈ سے دونوں بانہیں ان کی گردن میں ڈال دیں۔

"عمر تو خیر آپ کی بھی کوئی زیادہ نہیں،پر مجھے چونچلے کرنے سے کیوں روکتی ہیں اماں بی"۔اس نے شوخ انداز میں ناراضی جتائی۔

"ہم نہیں روکتے،شادی کے بعد جو چاہو شوق پورے کر لینا مگر کنواری لڑکیوں کو ایسے سنگھار نہیں کرنے چاہئیں میری لاڈو۔شادی پہ روپ نہیں آتا"۔اس کے سیاہ لمبے بالوں کو انگلیوں سے سلجھاتے روزینہ بیگم نے پیار سے سمجھایا۔وہی برسوں پرانی باتیں جو سینہ بسینہ چلتی روائتوں کا حصہ بن چکی تھیں۔روزینہ بیگم کی سوچ بھی کچھ ایسی ہی تھی۔گو بیٹی سے محبت بھی شدید تھی،اتنی کہ کوئی بات ٹالی نا جاتی تھی پر تربیت کا انداز ان کا سخت تھا۔صلہ کو

صبح شام یہ ٹوکا ٹاکی سننا پڑتی۔ یوں کیوں چل رہی ہو، لڑکیوں کو دھیمی اور متناسب چال چلنی چاہیئے۔ ارے دوپٹہ ٹھیک سے پہنو بڑی ہو گئی ہو۔ یوں منہ کھول کر ہنسنا منع ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

"تو بس ٹھیک ہے۔ پھر آپ میری شادی کر دیں۔" اس کی معصومانہ بات پہ اماں بی بے اختیار ہنسی تھیں۔ صلہ ان کے مزاج سے بخوبی آگاہ تھی۔ کیونکہ ایسی تمانصیحتوں کے بعد ان کی تان شادی پہ آکر ٹوٹتی تھی۔ مشکل سے وہ چودہ سال کی تھی پر لگتا تھا وزینہ بیگم اس کی پیدائش سے ہی اس کی شادی کا تصور کر چکی ہیں اور یہ سچ ہی تو ہوتا ہے۔ بیٹیاں تو پیدا ہوتے ہی پرایاں مال تصور کر لی جاتی ہیں کہ انہیں آگے جا کر اپنے وجود سے کسی اور کے آنگن کو مہکانا ہوتا ہے۔

"لو بھلا تو وہ میٹرک کے بعد کالج جانے کا پروگرام ختم ہو گیا جس کے لئے ابا جان کو سفارشیں کرائی جا رہی تھیں۔ اچھا بھئی ہمیں کیا کر دیتے ہیں اپنی لاڈو کا بیاہ"۔ روزینہ بیگم کو بیٹی کی شرارتیں سارا دن نہال رکھتی تھیں۔ کل دو ہی تو اولادیں تھیں ان کی پر صلہ اکلوتی بیٹی ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے چھوٹے ہونے کا بھی خوب فائدہ اٹھاتی تھی۔ اس گھر کی ساری رونق اسی کے دم سے تھی۔ جہاں بیٹھتی محفل کشت وزعفران ہو جاتی۔

"آپ کو تو پتا ہے مجھے لال رنگ کتنا پسند ہے لیکن آپ ہمیشہ ٹوک دیتی ہیں۔ اب اگر لپ اسٹک لگانے کی یہی شرط ہے تو پھر ٹھیک ہے کر دیجئے میرا بیاہ۔" کمال بے نیازی سے کہتے اس نے گردن اکڑائے کہا تھا۔ اسی وقت ثمر ہال میں داخل ہوا۔ اس کے سجے سنورے روپ نے بے اختیار دھڑکنوں میں سرسراہٹ پیدا کی تھی۔

"سرخ لپ اسٹک کی خاطر بندی اپنی تعلیم کی قربانی دے دے گی اماں بی"۔اس کی آمد سے بے خبر وہ اپنی ہی شوخیوں میں مصروف تھی۔اماں بی نے ہلکی سی چیت سر کے پچھلے حصے میں رسید کی تو وہ گرنے کے سے انداز میں ان کی گود میں ڈھیر ہو گئی۔

"یہاں دروازے میں کیوں کھڑے ہیں؟" پیچھے سے آتی فارینہ نے ثمر کو وہاں رکا دیکھ کر حیرت سے سوال کیا۔وہ یوں چونکا جیسے کوئی چوری پکڑی گئی ہو۔اسی وقت اماں بی اور صلہ دونوں کی نظر ایک ساتھ ثمر اور فارینہ پہ پڑی۔

"ارے بیٹا وہاں کیوں کھڑے ہو۔اندر آؤ۔"اماں بی کے محبت سے بلانے پہ فارینہ، ثمر کو خفگی سے دیکھتی اندر چلی گئی، پیچھے زیرِ لب مسکراتا ثمر بھی ہال میں داخل ہو گیا تھا۔

"السلام علیکم ممانی جان"۔روزینہ بیگم نے فارینہ کے سر پہ شفقت سے ہاتھ پھیرتے ماتھے پہ بوسہ دیا۔وہ سلام کر کے ان کے پاس ہی تخت پہ بیٹھ گئی تھی۔

"یوں اچانک کیسے آنا ہوا میرے بچوں کا؟" اماں بی نے خوش اخلاقی سے پوچھا۔ثمر نے صوفے پہ بیٹھتے فارینہ کو آنکھ سے اشارہ کیا۔

"ثمر بھائی کی ٹریننگ شروع ہو رہی ہے نا ممانی جان تو آپ سے ملنے آئے تھے"۔فارینہ نے مدعا بیان کیا تو روزینہ بیگم مسکرا کر ہلاتیں دعائیں دینے لگیں۔

"اچھا اچھا ماشاءاللہ۔۔۔خیر سے جاؤ اور خیر سے واپس آؤ۔"

"ارے واہ۔۔۔اس کا مطلب اگلی بار ثمر بھائی اپنی یونیفارم میں ملنے آئیں گے۔ سچی مجھے تو بہت پسند ہے پولیس کی یونیفارم"۔پاس بیٹھی صلہ نے دونوں ہاتھ ملتے کچھ اس انداز میں کہا جیسے اس وقت اس کی آنکھوں کے سامنے ثمر اسی یونیفارم میں موجود تھا۔ ثمر کو اپنا دل ہاتھوں سے نکلتا محسوس ہوا تھا۔اس کی یہی شوخ و چنچل باتیں ثمر کو پچھلے کچھ عرصے سے بے قرار رکھنے لگی تھیں۔

"بس اسی لئے تو پہنیں گے یونیفارم"۔صلہ کے ساتھ بیٹھی فارینہ زیرِلب بڑبڑائی۔

"کیا مطلب؟؟"صلہ اس سرگوشی کا مفہوم نا سمجھتے ہوئے حیرت سے بولی تو ثمر نے کھا جانے والی نگاہوں سے بہن کو دیکھا۔

"کچھ نہیں"۔ مسکرا کر بھائی کو آنکھ مارتے فارینہ نے صلہ کو تسلی دی۔وہ کچھ بھی تو نہیں سمجھی تھی۔ سر ہلاتی خاموش ہو گئی۔

"صلہ اگلے ہفتے تمہاری سالگرہ ہے نا تو میں یہ گفٹ تمہارے لئے لایا تھا۔ میں تو یہاں ہوں گا نہیں سوچا جانے سے پہلے تمہیں دیتا جاؤں"۔ ثمر نے ہاتھ میں پکڑا ایک خوبصورت بیگ صلہ کی طرف بڑھایا جسے اس نے جلدی سے پکڑا اور کھولنے لگی۔ اندر کچھ قیمتی تحائف تھے جو صلہ نے ایک ایک کر کے اماں بی کو دکھاتے اپنی بے تحاشہ خوشی کا اظہار کیا تھا۔

"ارے واہ ثمر بھائی آپ کتنے اچھے ہیں۔ آپ کو میری سالگرہ کا دن ہمیشہ یاد رہتا ہے"۔ ثمر اس اظہارِ تشکر پہ ممانی جان کی موجودگی میں مسکرانے کے سوا کچھ اور کر بھی کیا سکتا تھا۔

☆☆☆

سفید کلف زدہ کرتے کی سلوٹیں درست کرتے اس نے ڈریسنگ ٹیبل پہ رکھے اپنے مہنگے کلون سے خود پہ اسپرے کیا۔ تیز مہک پورے کمرے میں آن کی آن میں پھیل گئی تھی۔ڈریسنگ پہ رکھی گھڑی اٹھا کر کلائی میں پہنتے شیشے میں خود پہ ایک ناقدانہ نگاہ ڈالتے وہ احساسِ تفاخر سے مسکرایا اور پھر تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

"رکیں۔۔میری بات سنیں"۔وہ کاریڈور میں تھا جب پیچھے سے آتی آواز پہ اس کے قدم رک گئے۔وہ پھولے ہوئے سانس کے ساتھ اس کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔

"افف، کیا مصیبت ہے۔ کتنی بار کہنا پڑے گا گھر سے نکلتے پیچھے سے آواز مت دیا کرو۔ بدشگونی ہوتی ہے"۔اس نے خائف اور اکھڑے لہجے میں کہتے اپنی کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی۔

"آپ اس وقت کہاں جا رہے ہیں؟"اپنی مہندی لگی ہتھیلیوں کو مسلتے وہ ڈرتے ڈرتے بولی تھی پر اس کے شوہر کے ماتھے کی سلوٹیں گہری ہوئی تھیں۔

"کیوں؟ کیا اسوقت گھر کے باہر کرفیو لگا ہے؟"انداز ڈپٹنے کا سا تھا کہ اس کا خون ہی خشک ہو گیا پھر بھی ہمت کر کے پوچھ ہی بیٹھی۔

"اتنی رات کو۔۔۔"اس کی گھورتی نگاہوں کو محسوس کرتے جملہ ادھورا چھوڑ دیا گیا تھا۔

"مردوں کو سو کام ہوتے ہیں۔اب کیا ہر بار گھر سے نکلتے تمہیں تفصیلی رپورٹ پیش کر کے اجازت لینی ہو گی مجھے"۔وہ باقاعدہ چڑ کر بولا تھا۔وہ لب کاٹتے خاموش رہی۔کہنے کو بچا بھی کیا تھا۔

"جا کر سو جاؤ اور آئندہ خوامخواہ پیچھے سے مت پکارنا"۔سر جھکائے اس کے قدموں کی آواز کاریڈور سے باہر نکلتے سنی تھی۔آنسوؤں کی چند بوندیں صبر کے بند توڑ کر آنکھوں سے بہنے لگیں۔فقط چند روز ہی تو ہوئے تھے اس کی شادی کو پر آج تک اس نے اپنی بیوی کے سجے سنورے روپ کو نگاہ بھر کر دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔ خاموشی سے آنسو بہاتی وہ کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی۔باہر موسلا دھار مینہ برستا اس کے ارمانوں پہ ماتم کر رہا تھا۔وہ جانتی تھی آج بھی اس کے شوہر کی واپسی صبح ہی ہو گی۔

☆☆☆

کمرے میں بچھے جہازی سائز بیڈ پہ پڑے اس نحیف وجود میں اسے دیکھ کر حرکت ہوئی تھی۔تبریز نے تیزی سے آگے بڑھ کر اپنے مضبوط بازوؤں کی مدد سے سہارا دیتے انہیں اٹھنے میں مدد کی۔بیڈ کراؤن سے پشت ٹکائے انہوں نے بے اختیار اپنے کمزور ہاتھوں سے اس کے ہاتھوں کو تھام لیا تھا۔وہ دھیما سا مسکرایا اور ان کے پاس بیڈ پہ ہی بیٹھ گیا۔ان بوڑھی بے جان آنکھوں میں بھری وحشت آہستہ آہستہ دم توڑنے لگی۔خوشی کا احساس ان کے ہر انداز سے صاف ظاہر تھا۔

"آخر تم نے اپنی قسم توڑ ہی دی"۔ اپنے خشک ہونٹوں پہ زبان پھیرتے انہوں نے ہنسنے کی ناکام کوشش کی اور اس کوشش میں انہیں کھانسی کا زبردست دورہ پڑا تھا۔ تبریز نے پاس پڑی میز پہ پانی کی تلاش میں نگاہ دوڑائی۔ کمرے میں پانی موجود نہیں تھا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے اس نے بلند آواز میں پانی کے لئے پکارا۔ وہ اب اپنے دائیں ہاتھ سے ان کی کمر کو تھپتھپاتا انہیں پرسکون کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چند ثانیے بعد کمرے کے دروازے پہ دھیمی سی دستک ہوئی۔ اجازت ملتے ہی ہاتھوں میں پانی سے بھرا جگ اور گلاس تھامے وہ اندر داخل ہوئی تھی۔ میز پہ دونوں چیزیں رکھ کر اس نے جگ سے گلاس میں پانی انڈیلا اور اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے نگاہ اٹھا کر اپنے عقب میں کھڑے اس وجود کو دیکھا۔ سر تا پاء سیاہ لباس میں ملبوس وہ بے تاثر چہرے کے ساتھ نگاہیں جھکائے اس کے پاس کھڑی تھی۔ اس کی نظروں کو خود پہ مرکوز پا کر اس نے بے اختیار اپنا نچلا لب کاٹا۔

"پانی"۔ ان کی کھانسی نے اس ارتکاز کو توڑا تھا۔ آگے بڑھا گلاس تیزی سے تھامتے تبریز کی انگلیاں ان نازک ہاتھوں سے ٹکرائیں۔ وہ سر سے پاؤں تک کانپ گئی تھی۔ تبریز نے اس کے تاثرات واضح محسوس کئے پر اس پہ توجہ دیئے بغیر وہ اب ایک ہاتھ بوڑھے باپ کی کمر پہ ٹکائے دوسرے ہاتھ سے گلاس ان کے لبوں سے لگائے انہیں پانی پلا رہا تھا۔ اسے لگا کمرے میں اب اس کی موجودگی بے معنی ہے۔ وہ الٹے پیروں واپس لوٹ گئی پر دروازے پہ پہنچ کر اس نے گردن گھما کر پیچھے دیکھا تھا۔ تبریز کی پشت تھی اور وہ اب بھی اپنے بوڑھے باپ کی طرف متوجہ تھا۔ برسوں بعد وہ اسے اتنے قریب سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے بال بھورے سیاہ اور نفیس انداز میں تراشے ہوئے تھے جو اس کی صاف رنگت پہ اچھے لگ رہے تھے۔ وہ دراز قد تھا اور بلاشبہ ایک وجیہہ مرد جس پہ آج بھی

کوئی حسین لڑکی دل و جان سے فدا ہو سکتی تھی کہ دل کو باندھ لینے کی اس میں صلاحیت تھی۔ پر افسوس وہ اس کا ہو کر بھی اس کا کچھ نہیں تھا۔ اس کے وجود سے غافل، لاتعلق اس کا دھیان وہیں تھا جن کی خاطر وہ سالوں بعد واپس آیا تھا۔ وہ برسوں پہلے بھی اس گھر اور اس کی زندگی میں بے مایاں و بے توقیر تھی، اس کا مقام آج بھی نہیں بدلا تھا۔

اچانک تبریز نے گردن گھما کر اس کی کمرے میں موجودگی کی تصدیق کی تھی۔ وہ جو اپنی بدقسمتی کے ماہ و سال گنتی اپنے ہی دھیان میں گم تھی اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر گھبرا گئی اور پھر تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

اتنے سالوں بعد جو تبریز گھر واپس آیا تو یہ ناممکن تھا اس سے ملاقات نا ہوتی۔ باپ سے مل کر وہ سیدھا اسی کے کمرے کی طرف آیا تھا۔ اجازت ملنے پہ وہ اندر پہنچا تو وہ اس وقت تبریز ہی کی منتظر تھی۔ وہ جس کی التجا پہ اسے واپس لوٹنا پڑا تھا۔

"تو تم آ ہی گئے"۔ سنجیدہ چہرے اور مسکراتی آنکھوں سے سوال کرتے وہ اسے بہت عجیب لگی تھی۔ شائد عجیب سے بھی کچھ زیادہ۔۔۔۔۔ وہ سامنے رکھے صوفے پہ بیٹھ گیا۔ یقیناً وہ اس پل اسی کی منتظر تھی۔

"کیسی ہیں آپ؟" سالوں بعد ملنے پر بھی اس کے پاس اسے کہنے سننے کو کچھ تھا ہی نہیں۔ لفظوں کا کاسہ خالی تھا یا وہ خود کھوکھلا ہو چکا تھا پر کب تک یونہی خاموش بیٹھا رہتا۔ کچھ نا کچھ تو کہنا ہی تھا۔ اس کے سوال پہ ایک تلخ سی مسکراہٹ نے رانیہ کے لبوں کا احاطہ کیا تھا۔

"کیسی لگ رہی ہوں؟" بے اختیار اس کی نگاہیں اس کے چہرے پہ جا رکیں۔ گزرے ماہ و سال کا شائبہ بھی نا تھا یا شائد وقت نے اسے پہلے سے زیادہ حسین بنا دیا تھا۔ وہ معصومیت جو اس کے حسن کو کو چار چاند لگاتی تھی ہنوز اس کے چہرے کا احاطہ کئے ہوئے تھی۔

"سوال کے جواب میں سوال نہیں ہوتا"۔ اچانک تبریز کو اپنی نظروں کی گستاخی کا احساس ہوا تو اس نے فوراً نگاہوں کا رخ موڑ لیا تھا۔

"زندہ ہوں"۔ اس بار جواب دھیمے لہجے میں آیا تھا۔ وہ خاموش رہا۔ جانتا تھا اس زندگی کے معنی کیا ہوں گے۔

"تم کہو، ہم سے دور جا کر خوش تو رہے نا"۔ اس بار شکوہ کیا گیا تھا۔

"خوشی تو انسان کے اپنے اندر ہوتی ہے، وہاں نا ملے تو ادھر ادھر بھٹکنے سے کب حاصل ہوتی ہے۔" وہ زہر خندہ انداز میں مسکرایا۔

"تو کیا حاصل ہوا پھر اس جلاوطنی سے جب ہم خوش رہے نا تم۔" دوسرے لفظوں میں اسے حقیقت سے فرار کا طعنہ مارا گیا تھا اور یہ طعنہ تو ہر روز اسے اس کا ضمیر بھی مار رہا تھا۔ پر اس کی زبان سے چوٹ شدید تر تھی۔

"بہت تھک گیا ہوں، کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔" اور کہنا تو یہ چاہتا تھا کہ زندگی سے بھاگتے بھاگتے تھک چکا ہوں۔ رک کر اس تھکن زدہ وجود کو آرام دینا چاہتا ہوں۔ کسی کی آہ ہے جو سالوں سے پیچھا کرتی عاجز کر رہی ہے۔ ضمیر کو کچوکے دے رہی ہے۔ پر وہ کچھ بھی کہہ نہیں پایا تھا سو آج بھی چپ تھا۔

"ٹھیک ہے۔ تمہارا کمرہ صاف کروا دیا تھا۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو قدسیہ یا کسی دوسرے ملازم سے کہہ دینا۔" اسے صوفے سے اٹھتا دیکھ کر رانیہ بھی الوداعی انداز میں کھڑی ہو گئی۔ اس کی بات پہ سر ہلاتا وہ متانت سے کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا۔ جونہی تبریز نے دروازے کی ناب کو تھاما دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا تھا اور ایک بار پھر وہ وہاں اس کے بالکل سامنے کھڑی تھی۔ چند لمحے آکر گزر گئے اور وہ دونوں ہی اپنی جگہ سن سے کھڑے رہے اور پھر اس کی کشمکش کو آسان کرتے وہ راستے سے ہٹ گیا تو وہ جھجکتی ہوئی اندر داخل ہو گئی۔

"تم کیا کر رہی ہو میرے کمرے میں؟" اس سے پہلے کہ وہ کمرے سے باہر نکلتا رانیہ کی چنگھاڑتی ہوئی آواز پہ چونک کر اس نے پیچھے دیکھا تھا۔

"قدسیہ اماں نے کہا تھا آپ کا کمرہ صاف کر دوں"۔ وہ نظریں جھکائے ایک مجرم کی طرح اس کے سامنے کھڑی تھی۔

"دفع ہو جاؤ یہاں سے اور آئندہ کبھی میرے کمرے میں بھول کر بھی پیر ڈالا تو کتوں کے آگے ڈلوا دوں گی۔" وہ بھوکی شیرنی کی طرح غرائی تھی۔ چاہ کر بھی تبریز قدم آگے نہیں بڑھا پایا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا وہ اس

وقت اس سچویشن میں کیا کرے۔ جانے کیوں اسے رانیہ کا یہ انداز تکلیف دے رہا تھا پر خاموش رہنا اس کی مجبوری تھی کہ وہ اسے جھوٹی امید دلانا نہین چاہتا تھا۔ آنکھوں میں آنسو لئے وہ اس کے پاس سے گزری تو بے اختیار تبریز نے نظریں چراتے منہ دوسری طرف پھیر لیا تھا۔

پیچھے رانیہ غصے سے بے قابو انگلیاں چٹخ رہی تھی جیسے اس کی برداشت جواب دے چکی ہو۔

"یہ قدسیہ بھی نا۔۔۔۔ کتنی بار کہا ہے مجھے اس کی شکل نظر نہیں آنی چاہیئے مگر یہ ہر بار اسی کو بہانے سے میرے پاس بھیج دیتی ہے جیسے اس گھر کے سارے ملازم مر گئے ہیں"۔ رانیہ کی بڑبڑاہٹ اور ناگواری کمرے سے باہر نکلنے پر بھی تبریز کو صاف اور واضح سنائی دی تھی۔

☆☆☆

رفیق احمد صدیقی کا تعلق کھاتے پیتے متمول گھرانے سے تھا۔ گھر میں دولت کی چکاچوند نا سہی پر اچھی زمینداری تھی۔ اچھی بیوی اور اولاد کی صورت قدرت نے انہیں اپنی ہر نعمت سے نواز رکھا تھا۔ وضعداری وراثت میں ملی تھی تو اپنی اعلیٰ اخلاقیات کی بدولت انہوں نے خاندان اور معاشرے میں اپنا وقار قائم رکھا ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آج برسوں بعد بھی بہن بھائیوں میں تعلقات بہترین تھے۔ اپنے انہی تعلقات کو مزید بہتر اور مستحکم بنانے کے لئے رفیق احمد نے اپنی چھوٹی بہن ذکیہ کی بیٹی فارینہ کو اپنے بڑے بیٹے فیروز کے لئے مانگ رکھا تھا تو دوسری طرف ذکیہ بیگم بھی اپنے بیٹے ثمر کی خواہش پہ اکلوتی بھتیجی صلہ کو دل و جان سے بہو بنانے کی خواہش رکھتی تھیں۔ گو رفیق

احمد کا گھرانہ بہت زیادہ تعلیمی رجحان نہیں رکھتا تھا شائد اسی لئے رفیق احمد کی طرح فیروز نے بھی بس میٹرک کے بعد زمینداری سنبھال لی تھی البتہ صلہ کو جنون کی حد تک آگے پڑھنے کا شوق تھا اور اپنی اس خواہش کے پیشِ نظر وہ رفیق احمد سے آگے کالج میں داخلہ لینے کی اجازت بھی طلب کر چکی تھی۔ ذکیہ بیگم کے دونوں ہی بچے اچھے خاصے لائق فائق تھے۔ ثمر نے حال ہی میں مقابلے کا امتحان پاس کیا تھا اور اب اپنی پولیس ٹریننگ کے سلسلے میں لاہور اکیڈمی جا رہا تھا جبکہ فارینہ بھی مقامی کالج سے انٹر کر رہی تھی۔ ثمر کے برعکس فارینہ کو ماموں کا گھرانہ کچھ خاص پسند نہیں تھا اور اس کی واحد وجہ فارینہ کا فیروز سے جڑا رشتہ تھا۔ ہر لڑکی کی طرح فارینہ کے دل میں بھی اپنے شریکِ حیات کا ایک تصور تھا لیکن شومئ قسمت فیروز اس پہ کسی طور پورا نہیں اترتا تھا۔ فیروز میں بظاہر تو کوئی عیب نا تھا پر فارینہ کو اس کی تعلیم سے دوری ہی سب سے بڑا عیب دکھائی دیتی تھی۔ دوسرے وہ بلا کا جذباتی اور کسی حد تک احمق تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پہ اوور ری ایکٹ کرنا اس کی عادت تھی تو بے حد معمولی ایشوز پہ جھگڑا کرنا اس کا معمول۔ فارینہ ایک حساس طبیعت کی نازک مزاج لڑکی تھی۔ ادب، شاعری اور رنگوں سے دل بہلانے والی۔ پہلی بار جب اس نے فیروز کے پاس ایک بے حد قیمتی ریوالور دیکھا تھا تو وہ بے تحاشہ ڈر گئی تھی جسے وہ بڑی شان سے ثمر کو دکھا رہا تھا۔ پھر ایک دن فیروز نے فارینہ کی آنکھوں کے سامنے اسی ریوالور سے رکھوالی والے کتے کو مار ڈالا۔ اس وقت تو فارینہ کو فیروز سے نفرت ہی ہو گئی تھی گو بعد میں پتا چلا وہ کتا پاگل ہو کر اپنے ہی لوگوں کاٹنے لگا تھا پر فارینہ کا دل فیروز سے بدگمان ہو چکا تھا۔ وہ اسے بچپن سے جانتی تھی اور یہی وجہ تھی کہ فیروز سے جڑے رشتے کو اس نے کبھی بھی دل سے قبول نہیں کیا تھا۔ آج بھی وہ یہاں نہیں آنا چاہتی تھی پر ثمر کی درخواست پہ اسے یہاں آنا ہی پڑا اور پھر ایسا تو ممکن ہی نہیں تھا وہ یہاں آتی اور اس کا سامنا فیروز سے نا ہوتا۔ کچھ

دیر روزینہ ممانی اور صلہ سے گپیں لگا کر وہ اب ثمر کی راہ دیکھ رہی تھی جو بیٹھک میں رفیق احمد کے ساتھ محوِ گفتگو تھا کہ اچانک باہر سے فیروز کو آتا دیکھ کر اس کا موڈ بری طرح خراب ہو گیا تھا۔

"کیا بات ہے محترمہ مزاج کچھ برہم نظر آتے ہیں"۔فارینہ کو دیکھ کر تو جیسے اس کی روح تک سیراب ہو گئی تھی۔ وہ لپک کر اس تک پہنچا تھا پر فارینہ نے اسے دیکھ کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"تم سے مطلب۔۔۔۔اپنے کام سے کام رکھا کرو۔ہٹو میرے راستے سے۔"فیروز اس پہ جتنی جان چھڑکتا تھا فارینہ اتنا ہی اسے دھتکارتی تھی۔

"راستہ ہی نہیں تمہاری تو منزل بھی ہم ہی ہیں مائی ڈیئر۔یقین نا آئے تو کل اباجی کو بھیج دوں پھوپھو کے پاس شادی کی تاریخ فائنل کرنے؟"وہ بھی ایک نمبر کا ڈھیٹ تھا جس پہ کبھی فارینہ کی ملامت کا اثر ہی نہیں ہوا تھا۔وہ اسے سامنے کھڑا دیکھ کر سائیڈ سے نکلنے لگی تھی کہ اس نے فارینہ کی کلائی مضبوطی سے تھام لی۔فارینہ کا دماغ گھوم گیا تھا ۔اس سے پہلے کہ وہ کوئی گل فشانی کرتی فیروز نے ہنستے ہوئے ایکدم اس کا بازو چھوڑ دیا۔

"تم جیسے جذباتی اور بیوقوف انسان سے شادی کرنے سے تو اچھا میں ساری عمر کنواری گزار دوں فیروز"۔اپنی کلائی کو رگڑتے اس نے درد کی شدت کو کم کرنے کی کوشش کی۔ساتھ ہی غصے سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔جانتی تھی یہ سب لفاظی ہے۔ہو گا وہی جو بڑوں کا فیصلہ ہے کیونکہ ذکیہ بیگم کبھی بھائی کو ناراض نہیں کریں گیں۔

"زندگی تو تمہیں میرے ساتھ ہی گزارنی ہے۔ ہنس کر یا رو کر فیصلہ تمہیں کرنا۔ جو شے فیروز کے نام سے منسوب ہو وہ اس سے کبھی دستبردار نہیں ہوتا"۔ فیروز نے انگلی کی پوروں سے اس کی تھوڑی اپنی طرف موڑتے دھمکی آمیز لہجے میں کہا تو وہ اندر تک سلگ گئی۔

"میں کوئی چیز نہیں ایک جیتی جاگتی انسان ہوں اور میری بھی کچھ خواہشات ہیں۔ مجھے اپنی زندگی کا فیصلہ اپنے مطابق کرنے کا پورا اختیار ہے اور میں تمہیں اپنی زندگی برباد کرنے نہیں دوں گی"۔ غصے سے پیر پٹختی وہ کمرے سے نکل گئی تھی۔

"جتنا مرضی پھڑ پھڑا لو میری جان۔۔۔ آنا تو آخر تمہیں اس شکاری کے جال میں ہی ہے"۔ فیروز قہقہہ لگاتا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اس پہ فارینہ کی تلخی کا چنداں کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

☆☆☆

"کیا ہوا فاری، یہ منہ کیوں اتنا پھلا رکھا ہے؟" فیروز کی حرکتوں پہ منہ بسورتی وہ اپنی انگلیاں مروڑتی رو دینے کو تھی کہ ثمر وہاں آ گیا۔ اس نے آتے ہی بہن کے بگڑے تیور محسوس کر لئے تھے۔ فیروز کی انہی باتوں کی وجہ سے وہ یہاں نہیں آتی تھی اور آج پھر اس نے اپنے رویے سے فارینہ کو نا صرف مایوس کیا تھا بلکہ اس رشتے کو لے کر دل میں پڑی گرہ مزید مضبوط کر دی تھی۔ اسے تو اپنی قسمت پہ رونا آتا تھا کہ کیا دیکھ کر ماں نے اس کا رشتہ ایسے گنوار انسان سے طے کر دیا ہے جسے تمیز چھو کر بھی نہیں گزری لیکن یہ باتیں وہ بس سوچ ہی سکتی تھی کیونکہ ابھی ان کے

گھرانے اتنے ماڈرن نہیں ہوئے تھے جہاں بیٹیوں کی خواہش پہ رشتے طے کئے جاسکتے۔اس کے لئے تو یہی غنیمت تھی کہ وہ خاندان کی پہلی لڑکی تھی جو کالج جارہی تھی۔پر آج فیروز سے ہوئی منہ ماری کے بعد اس نے طے کرلیا تھا وہ گھر جاکر ماں سے اس رشتے کو ختم کرنے کی درخواست ضرور کرے گی۔

"یہ سب آپ کی وجہ سے ہورہا ہے ثمر بھائی۔صلہ کے چکر میں آئے دن آپ یہاں پہنچ جاتے ہیں اور ساتھ مجھے بھی گھسیٹ لیتے ہیں"۔اب اسے یہ تو بتا نہیں سکتی تھی کہ فیروز اس کے ساتھ کیسی باتیں کرکے گیا ہے۔ایک تو بھائی سے حیا کا معاملہ دوسرے کچھ بھی تھا ثمر بھی جوان اور گرم خون رکھتا تھا اس پہ نئی نئی پولیس میں بھرتی۔مبادا اس چکر مین کوئی بڑا جھگڑا ہی نا ہو جائے۔اس نے شکایت تو کی پر اندر کی بات گول کر گئی تھی۔

"یار وہ تمہاری ہونے والی بھابھی ہے۔اتنا تو میری خاطر کر ہی سکتی ہو تم"۔ثمر نے بہن کو منانے کی کوشش میں دایاں بازو دوستانہ انداز میں اس کے گرد حمائل کر دیا۔فارینہ نے خفگی سے اسے دیکھا اور پھر اس کا بازو جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔

"بہت فضول انسان ہیں آپ۔اور اس سے بھی پوچھا ہے کبھی وہ کیا چاہتی ہے یا بس خود ہی طے کرچکے ہیں کہ اسے میری بھابھی بنانا ہے"۔ثمر بھی اس کے پیچھے پیچھے گھر سے باہر نکل آیا۔

"وہ تو ابھی بالکل بچی ہے۔اسے ان سب باتوں کی کیا خبر۔ویسے ماموں جان کو مجھ سے بڑھ کر شاندار داماد کہاں ملے گا"۔ثمر نے قمیض کا کالر اونچا کرتے اسٹائل مارا تو فارینہ کی ہنسی نکل گئی۔

"اچھا اب اگر آپ کا خیالی پلاؤ پک چکا ہو تو گھر چلیں۔ پتا نہیں کیوں مجھے اس گھر میں شدید الجھن ہوتی ہے"۔ وہ دونوں اب گاڑی تک پہنچ چکے تھے۔

"اچھا اب غصہ نا کرو، گھر ہی جا رہے ہیں"۔ ثمر نے مصالحتی انداز میں ہاتھ کھڑے کرتے کہا اور پھر گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ جیسے جیسے گاڑی اس گھر سے دور جا رہی تھی اس کا موڈ بھی نارمل ہو رہا تھا۔

☆☆☆

"اماں میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔ کوئی اور کام تو نہیں"۔ اپنی سیاہ چادر سے گیلے ہاتھ پونچھتے اس نے کچن کا تنقیدی جائزہ لیا۔ جب سے قدسیہ کے جوڑوں میں درد رہنے لگا تھا وہ کم ہی کسی کام کو ہاتھ لگاتی تھی۔ خود اسے بھی یہ بات پسند نہیں تھی کہ ایک عمر رسیدہ عورت اتنی تکلیف کے ساتھ گھر کے کام کاج کرے۔ گھر میں چند دوسرے ملازم بھی تھے مگر کچن سالوں سے قدسیہ کے ہاتھ میں تھا اور اب قدسیہ نے اسے بھی باقاعدہ ماہر کر دیا تھا۔ جس دن اس کی جگہ کھانا قدسیہ پکاتی تو لازمی اعتراض اٹھایا جاتا پر ہاں کبھی اس کے لئے تعریفی کلمہ کسی کی زبان سے نہیں نکلا تھا۔

"اور تو کوئی کام نہیں بس یہ دودھ کا گلاس تبریز کے کمرے میں رکھنا ہے۔" برتن تو وہ پہلے ہی سب سنبھال چکی تھی اور کچن بھی صاف ستھرا نظر آ رہا تھا۔ قدسیہ نے دودھ کی پتیلی فریج میں رکھتے کچن کاؤنٹر پہ رکھے گلاس کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے کہا تو وہ اپنی جگہ فریز ہو گئی۔

"اماں۔۔میں وہاں کیسے جاسکتی ہوں"۔نگاہیں جھکائے اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔یوں تو صبح سے متعدد بار اس سے سامنا ہو چکا تھا۔وہ تو اپنے روٹین کے کاموں میں مصروف تھی اور اس دوران کبھی میز پہ کھانا لگاتے تو کبھی جھاڑ پونچھ کرتے اس پہ نگاہ پڑ جاتی تھی۔اپنے باپ کی طبیعت کے پیشِ نظر وہ آج زیادہ وقت ان کے کمرے میں ہی رہا تھا اور جب سے ان کی طبیعت خراب ہوئی تھی ان کی دیکھ بھال اور کام کاج کی اضافی ذمہ داری بھی اس پہ ہی آپڑی تھی۔یہ الگ بات اپنی بیماری کے باعث وہ اتنے چڑچڑے ہو گئے تھے کہ پہلے سے بھی زیادہ ڈانٹ پھٹکار اور نفرت زدہ الفاظ اس کی طرف اچھالتے رہتے تھے۔تبریز کی موجودگی میں بھی آج کئی بار انہوں نے اسے دھتکارا۔جس طرح وہ باپ کے پاس بھی چپ سادھے بیٹھا اس کی بے عزتی ہوتی دیکھتا رہا۔اس کے بے تاثر چہرے کو دیکھ کر اسے اور بھی تکلیف ہوئی تھی پر تکلیف تو جیسے اب سانسوں کی طرح زندگی میں شامل تھی۔

"کیوں بٹیا تمہارے وہاں جانے پہ کوئی پابندی لگی ہے کیا۔سارے گھر کا کام کرتی ہو تو وہاں کیوں نہیں جاسکتی"۔قدسیہ کا لہجہ عام سا تھا۔

"ان کو پتا چل گیا تو۔۔۔۔۔" اس کا اشارہ رانیہ کی طرف تھا۔سب سے زیادہ خوف تو اسی کا تھا۔وہ قدسیہ سے اپنے خدشے کا اظہار کئے بناء نہیں رہ پائی تھی۔

"نیند کی دوا لے کر سو چکی ہیں۔سو تم ان کی طرف سے بے فکر ہو جاؤ۔اتنے برسوں بعد وہ گھر لوٹا ہے میری بچی۔کیا پتا اسی بہانے تیری سوئی ہوئی تقدیر جاگ جائے"۔اسے قدسیہ کی خوش خیالی پہ ہنسی آئی تھی۔اس گھر میں بس ایک قدسیہ ہی تھی جسے اس سے دلی ہمدردی تھی۔پہلی بار سب کی نفرت اور غصے سے خوفزدہ ہو کر اس نے قدسیہ

کے پیچھے ہی پناہ لی تھی۔ قدسیہ کو اس پہ ترس بھی آتا تھا۔ جس طرح اسے گھر کا فرد ہوتے ہوئے بھی ملازموں سے بدتر جگہ رکھا گیا تھا، ہر کوئی اسے دیکھ کر ناک بھوں چڑھاتا تھا اس پہ یہ ظلم کہ شوہر بھی اسے قبول کئے بغیر گھر سے جا چکا تھا۔ ان حالات میں قدسیہ کا دل اس کی حالت دیکھ کر کٹتا تھا۔ انسان کی تخلیق تو ربِ کائنات نے اسی مقصد کے تحت کی ہے کہ دوسرے کا درد سمجھے یہ الگ بات یہاں اکثریت درد دینے کی وجہ بن جاتے ہیں۔ اس گھر میں قدسیہ کا وجود تنکا ہی سہی پر اس کے لئے بہت بڑا آسرا تھا۔ وہ جانتی تھی یہاں اگر کوئی اس کا خیر خواہ ہے تو بس ایک یہی بوڑھی عورت ہے پر یہ بھی سچ تھا وہ اپنے حال پہ صبر کر چکی تھی۔

"میں اسے تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کر چکی ہوں اماں۔ زندگی جیسے گزر رہی اسے یونہی گزر جانے دیں۔ ایک بار بدلی تھی تو سیلاب آ گیا تھا جس میں میرے سارے ارمان، ساری خوشیاں بہہ گئے تھے۔ اب کوئی تبدیلی سہہ نہیں پاؤں گی کیونکہ کھونے کو کچھ بچا ہی نہیں ہے"۔ کچن کاؤنٹر کے ماربل پہ ناخن سے لکیریں بناتے وہ بے بسی سے بولی اور اپنی چادر کا پلو سر پہ ٹکاتے کچن سے باہر نکل گئی۔

"اللہ تیرے حال پہ رحم کرے میری بچی۔ پتا نہیں کیسے سفاک لوگ ہوتے ہیں جو اپنی ہی اولاد کی بلی چڑھا دیتے ہیں"۔ پیچھے قدسیہ نے دونوں ہاتھ دعائیہ انداز میں اٹھائے اس کے لئے خیر کی دعا کی تھی اور پھر کاؤنٹر پہ رکھا گلاس اٹھا کر کچن سے باہر نکل گئی۔

☆☆☆

وہ بہت دنوں سے اس سے بات کرنا چاہ رہا تھا لیکن اتفاق سے موقع ہی نہیں مل پاتا تھا۔ جب بھی فون کرتا کبھی ممانی جان فون اٹھاتیں تو کبھی فیروز، ایسے میں وہ خود سے صلہ سے بات کرنے کی فرمائش کرتا جھجک رہا تھا پر آج تو یہ موقع قدرت نے اسے دیا تھا۔ اس پہ قسمت کی کرم نوازی کہ فون اٹھایا بھی صلہ نے ہی تھا۔

"کیسی ہو صلہ؟" اس کی آواز کو تو وہ لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں ثمر بھائی آپ بتائیں کیسی جا رہی ہے آپ کی ٹریننگ؟" دوسری طرف وہ بھی اسے پہچان کر بے حد ایکسائیٹیڈ ہو گئی تھی۔

"ٹریننگ زبردست چل رہی ہے۔ اور اس وقت تو میں نے تمہیں مبارکباد دینے کے لئے کال کی ہے۔ تمہارا داخلہ کالج میں جو ہو گیا ہے"۔ ثمر نے مسکراتے ہوئے اسے مبارک باد دی تھی۔

"سچی مجھے تو یقین نہیں آ رہا۔ اب مین بھی روز فاری آپا کی طرح کالج جایا کروں گی"۔ وہ بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھی اور اس کی خوشی ثمر کو سکون دے رہی تھی۔

"اچھا سنو، کیا تم مجھے یاد کرتی ہو"۔ اس نے کچھ سوچتے ہوئے گھمبیر لہجے میں سوال کیا۔

"آپ کو تو ہم سب ہر روز یاد کرتے ہیں۔ ابھی کل ہی ابا جی پھوپھو سے کہہ رہے تھے کہ اب جلد ہی فیروز بھائی اور فاری آپا کی شادی کر دیں گے"۔ صلہ اس کا اشارہ اب بھی نہیں سمجھی تھی۔ ایک پل کو تو اس کا دل کیا اپنا سر پیٹ ڈالے۔ خیر اب یہ مسئلہ بھی جلد ہی حل ہونے والا تھا۔ ماں سے تو وہ پہلے ہی بات کر چکا تھا۔ ان کا بھی یہی ارادہ تھا

کہ فارینہ کی رخصتی کے بعد ہی وہ صلہ کا رشتہ مانگیں گیں۔ پھر جب صلہ کا کالج مکمل ہو گا تو رخصتی ہو جائے گی۔ پر اس سے پہلے وہ اب صلہ کے دل کو ٹٹولنا چاہتا تھا کہ آخر وہ اس کے متعلق کیا سوچتی ہے۔

"میں سب کی نہیں، تمہاری بات کر رہا ہوں صلہ، کیا تم مجھے مس کرتی ہو"۔ اس نے ایک بار پھر اپنی بات پہ زور دیتے سوال کیا۔

"مس کیوں نہیں کروں گی۔ پتا ہے میں نے اپنی سب فرینڈز کو بتایا ہے کہ میرے ثمر بھائی پولیس آفیسر بن رہے ہیں۔ جب واپس آئیں گے تو کس شان سے یونیفارم پہنی ہو گی۔ جانتے ہیں وہ مجھ سے اتنی امپریس ہوئی کہ مت پوچھیں"۔ صلہ نان اسٹاپ شروع ہو گئی تھی۔ اس میں اپنی ہم عمر لڑکیوں سے کئی گنا زیادہ بچپنا تھا یہ تو ثمر بخوبی جانتا تھا لیکن اس کی اتنی کلئیر بات وہ نہیں سمجھے گی ایسی تو بہر حال اسے امید نا تھی۔ صلہ کو روزینہ بیگم نے بالکل بچہ بنا کر رکھا ہوا تھا۔

"اچھا یہ لیں اماں بی سے بات کریں اور میری طرف سے اللہ حافظ"۔ اچانک سامنے سے آتی روزینہ بیگم کو دیکھ کر اس نے جھٹ فون انہین تھمایا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ ثمر اب ممانی جان سے معمول کی باتیں کر تا بد مزہ ہو رہا تھا۔

ممانی جان نے بھی پورے شہر کا حال دریافت کر کے ہی فون بند کیا تھا اور اس وقت تک ثمر بھول چکا تھا کہ اس نے وہاں فون کیا کیوں تھا۔

☆☆☆

کمرے کا دروازہ لاک کر کے اس نے اپنی سیاہ چادر اتار کر کرسی پہ رکھی اور پھر گرنے کے سے انداز میں چارپائی پہ بیٹھ گئی تھی۔ آج کا دن سب دنوں سے الگ تو نہیں تھا پھر نجانے کیوں اس کے اعصاب بوجھل ہو رہے تھے۔ سالوں سے اس گھر میں نوکروں کی طرح ہڈیاں گھساتے اس نے کبھی خود کو اتنا تھکا ہوا محسوس نہیں کیا تھا۔ پھر آج کیوں اپنا وجود ٹکڑے ٹکڑے لگ رہا تھا۔ یا شائد یہ ماضی کی کرچیاں تھیں جو برسوں سے روح میں چبھی آج ناسور بن چکی تھیں۔ دھیان بار بار اسی طرف جا رہا تھا جس کے متعلق وہ نہیں سوچنا چاہتی تھی۔

اپنی سوچ پہ دو حرف بھیجتے وہ چارپائی سے اٹھی اور کمرے میں رکھی لکڑی کی بوسیدہ الماری کو کھولا۔ اندر کتابوں کا ایک ڈھیر تھا جو اتنے سالوں میں اکٹھا ہو گیا تھا۔ اس کی واحد پونجی جو اس اس بیگار کی صورت اس نے کئی سالوں میں جمع کی تھی۔ یہ سب قدسیہ اماں کی مہربانی تھی جو گھر والوں سے چھپ چھپا کر اسے فلک شیر کے ذریعے یہ کتابیں منگا دیتی تھیں۔ یہ کتابیں نہیں اس کی دنیا تھی جہاں وہ کچھ دیر کو ہی سہی اپنی زندگی کی تلخی اور غم بھلانے کی خاطر چلی جاتی تھی۔ خود پہ ہوئے ظلم پہ آنسو بہاتے بہاتے جب تھک گئی تو یہ کتابیں ہی تھیں جنہوں نے اسے آسرا اور پناہ دی تھی۔

الماری سے ایک کتاب نکال کر وہ واپس چارپائی پہ آ کر بیٹھ گئی۔ کل رات اس نے صفحے کا کونہ موڑ کر نشانی لگائی تھی۔ آج کتاب اسی صفحہ سے کھولی اور سیاہ حروف پہ نگاہیں جما دیں۔ اچانک نگاہ منتشر ہوئی تھی، دھیان بھٹکا تھا۔ اس بار اپنی توجہ کہانی پہ مبذول کرنے کی خاطر اس نے انگلی کی پور کو سطور پہ پھیرنا شروع کیا تاکہ یکسوئی قائم رہ

پائے لیکن وہ ناکام ہوئی تھی۔ کل تک یہ کتاب اسے اب تک پڑھی جانے والی ہر کتاب سے زیادہ دلچسپ محسوس ہو رہی تھی لیکن اس وقت اسے کتاب میں لکھا کوئی بھی لفظ سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا۔ جھنجھلا کر اس نے کتاب بند کر دی اور پاس رکھی میز پہ پٹخ دی۔ تکیہ درست کرتی وہ اب چارپائی پہ لیٹ چکی تھی۔ دایاں بازو آنکھوں پہ رکھتے اس نے آنکھیں موند لیں۔ اچانک اس کی شبیہہ نگاہوں کے سامنے نمودار ہوئی تھی۔ صبیح پیشانی، کنپٹیوں سے جھلکتے چند گرے بال، سنجیدہ نگاہیں اور۔۔۔۔۔ان آنکھوں میں اس کے لئے بے تحاشہ اجنبیت۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

"کتنا لاتعلق اور بے پرواہ ہے وہ مجھ سے" ۔اس کے کانپتے لبوں نے شکوہ کیا تھا۔

"بھابھی نے مجھے اس کے سامنے کتنا ذلیل کیا مگر اس نے تو۔۔۔۔" نگاہوں میں اس وقت وہ منظر گھوم گیا تھا جب اس کی عزت افزائی پہ

سر اٹھا کر بھی تو نہیں دیکھا تھا۔ اس گھر میں تو وہ روز ہی ایسے جملوں کا سامنا کرتی تھی جن میں اس کے لئے نفرت اور تحقیر ہوتی لیکن آج یہ ذلت اس کی موجودگی میں ہوئی تھی شائد اسی لئے اپنا وجود بڑا چھوٹا اور کمتر محسوس ہو رہا تھا۔ آنسو بے اختیار بہنے لگے تھے۔

آج سے پہلے اپنے دل میں تبریز کے لئے اسے اتنی نفرت کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔

☆☆☆

فارینہ اور فیروز کی شادی طے پا چکی تھی۔ ثمر شادی سے دو دن پہلے گھر پہنچا تھا۔ فارینہ سے ملنے گیا تو اس کا شکایتی دفتر کھل چکا تھا۔

"آپ نے بھی میرا ساتھ نہیں دیا نا ثمر بھائی"۔ رفیق احمد نے جب شادی کی بات کی تو فارینہ نے ماں سے کہنے کی بجائے ثمر کو کال کر کے رشتہ ختم کرنے کی سفارش کی تھی۔ وہ جانتا تھا اس اسٹیج پہ ایسا ہونا ممکن نہیں۔ اب بھلا سالوں پرانا طے پایا رشتہ ماں یونہی بس بیٹی کی ضد پہ توتوڑنے سے رہی تھیں۔ ثمر ان دونوں کے رشتے کی حساسیت سے باخبر تھا۔ پھر اس کی اپنی رائے فیروز کے متعلق اتنی بری نہیں تھی کہ وہ ایک محبت کرنے والا انسان تھا۔ تعلیم کی کمی البتہ اس کا منفی پہلو تھی۔ فارینہ کا دل رکھنے کو اس نے حامی بھر تو لی تھی پر ماں سے جو بات دبے دبے لفظوں میں ہوئی اس کا ذکیہ بیگم پہ الٹا ہی اثر ہوا تھا۔ انہوں نے دوٹوک اسے اس معاملے میں ٹانگ اڑانے سے منع کر دیا تھا۔

"تم جانتی ہو امی ماموں کے معاملے میں کسی کی نہیں سنتیں فاری۔ پھر میرے مطابق وہ اتنا برا ابھی نہیں جتنا تم نے اس کا امیج بنا رکھا ہے۔ مجھے امید ہے وہ تمہارا پورا خیال رکھے گا۔ اور ماموں ممانی بھی تو تم پہ جان چھڑکتے ہیں نا"۔ اس نے بہن کا موڈ ٹھیک کرتے اسے اس رشتے کے روشن پہلو دکھائے تھے۔ وہ نہیں چاہتا تھا فارینہ بھرے دل اور منفی جذبات لئے اپنی آنے والی زندگی کی شروعات کرے۔ فارینہ نے اس کی بات سمجھی تھی یا نہیں پر وہ خاموش ہو گئی تھی۔

گھر میں شادی کی رونقیں شروع ہو چکی تھیں۔ دونوں گھروں میں ہی مہمانوں کا شور تھا۔ پورے علاقے میں جشن کا سماں تھا کہ رفیق احمد نے اکلوتے بیٹے کی خوشیوں پہ دل کھول کر پیسہ خرچ کیا تھا۔ مہندی کی رات سب لوگ ایک ہی جگہ موجود تھے کہ برادری تو بہر حال ایک ہی تھی لہذا بڑے سے پنڈال میں دولہا اور دولہن کی مہندی کی رسم ادا کی گئی۔ نارنجی اور پیلے شرارے میں صلہ بنی سنوری یہاں سے وہاں بھاگتی پھر رہی تھی۔ دولہا کی اکلوتی بہن ہونے کے ساتھ ساتھ آخر وہ اس گھر کی اکلوتی بیٹی بھی تو تھی۔ روزینہ بیگم نے اسے بھی دسیوں کام دے رکھے تھے۔ ثمر سے اس کا سامنا اسی بھاگ دوڑ کے دوران ہوا جب وہ پھولوں اور مٹھائی کی ٹوکریاں ملازموں سے اندر منگوا رہی تھی۔ آج چند ماہ بعد اس نے صلہ کو دیکھا تو وہ اسے بدلی بدلی اور کچھ بڑی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ اب یہ کالج جانے کا اثر تھا یا شائد ثمر ہی اس کے ہجر میں زیادہ سوچنے لگا تھا۔ بہر حال یہ سچ تھا کہ وہ آج بے تحاشہ حسین لگ رہی تھی۔

"ایک پل کور کو تو جناب"۔ وہ اپنی نگرانی میں سامان اٹھوا کر اب ملازم کے پیچھے پیچھے تیز قدموں سے چلتی اپنا شرارہ سنبھالے ثمر کے پاس سے یوں گزری جیسے اسے دیکھا ہی نا ہو۔ ثمر نے اس کا ہاتھ کھینچ کر اسے وہیں روک لیا۔

"ثمر بھائی آپ؟" اس طرح اچانک روکے جانے پہ وہ اچھی خاصی گھبرا گئی تھی۔ اس نے واقعی ثمر کو نہیں دیکھا تھا۔ سینے پہ ہاتھ رکھے اس نے اپنی پھولی ہوئی سانس کو قابو میں کیا۔ کچھ تو شادی کے ہنگامے باقی یکدم ثمر کا اس کا راستہ روک لینا۔۔۔۔۔۔۔

"بندہ دائیں بائیں دیکھ کر چلتا ہے کیا پتا کوئی پرانا شناسا راہ میں کھڑا مل جائے"۔ اسے شرارت سے چھیڑتے ثمر نے نچلا لب دبائے اپنی ہنسی کو روکا۔ صلہ کا دایاں ہاتھ اب بھی اس کے ہاتھ میں ہی تھا۔ وہ دونوں پنڈال کی اینٹرنس سے ذرا ہٹ کر کھڑے تھے اور لوگوں کی توجہ تو اس وقت اسٹیج پہ تھی جہاں دولہا دولہن کے ساتھ ان کی فیملی موجود تھی۔

"ایک سے ایک نکما بھرا پڑا ہے اس گھر میں۔ مجال ہے جو کوئی کام بناء کہے ہو جائے۔ سب کچھ مجھے ہی دیکھنا پڑ رہا ہے۔ ایسے میں دھیان ہی کہاں رہتا ہے کون کس راستے پہ کھڑا ہے"۔ وہ بڑی بیبیوں کی طرح اپنی کارکردگی سناتے یوں بولی جیسے اس کے سوا کوئی کام کرنے والا ہے نا ہی ذمہ دار۔ انداز ایسا تھا کہ ثمر متاثر ہوئے بغیر نا رہ سکا۔ ایک نامحسوس سے انداز میں صلہ نے اپنا ہاتھ اس کی دسترس سے آزاد کرا لیا تھا۔ ثمر ایک ٹک اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا جہاں پنڈال کی روشنیوں کا عکس اس کی بینائی دھندلا رہا تھا۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہیں"۔ اسے اتنی یکسوئی سے اپنی طرف دیکھتا پا کر صلہ کچھ بے چین ہوئی تھی۔ پہلی بار اسے ثمر کی نظروں میں مچلتے جذبات پریشان کرنے لگے تھے۔ بے اختیار اس نے نظریں جھکائے اپنا کندھے پہ لہراتا دوپٹہ درست کیا تھا۔

"تم بہت بدل گئی ہو صلہ، دوسرے لفظوں میں پہلے سے بھی زیادہ حسین لگ رہی ہو۔" اچانک ثمر نے اس کے کان کے پاس سرگوشی کی تھی کہ صلہ کا پور پور تھرتھرا گیا تھا۔ اس سے پہلے تو کبھی اسے ثمر کی کہی باتیں اس انداز میں سمجھ نہیں آئی تھیں یا شائد اس سے پہلے اس نے کبھی یہ بے باکی کی بھی نہیں تھی۔ صلہ کے چہرے پہ نظریں

ٹکائے وہ وارفتگی سے اسے دیکھ رہا تھا اور صلہ جو ابھی کچھ دیر پہلے اپنی ذات میں مگن ہر سوچ سے لاپرواہ زندگی کے رنگوں اور بھائی کی شادی کو انجوائے کر رہی تھی اچانک ثمر کی نگاہوں کے طلسم میں الجھی ایک نئی کیفیت سے آشنا ہوئی تھی۔ وہ کیفیت جس سے کچھ عرصہ پہلے تک صلہ کا واسطہ بھی نہیں پڑا تھا۔ گھبرا کر اس نے آگے بڑھنے کی کوشش کی کہ اب اس کے اندر کی بے چینی چہرے سے عیاں ہونے لگی تھی۔ گالوں کی حدت لالی بن کر نمایاں ہو رہی تھی پر ثمر نے اپنا ہاتھ آگے کر کے اس کا راستہ روک دیا۔ وہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہوئی کہ مبادا ثمر سے ٹکرا نا جائے۔

"اس دن مین نے تم سے پوچھا تھا میں تمہیں کیسا لگتا ہوں۔ کیا تم نہیں جانتی ہو تم مجھے کتنی اچھی لگتی ہو؟ اتنی۔۔۔۔۔ کہ میں دن رات۔۔۔۔ صبح شام۔۔۔۔۔۔ تمام عمر تمہیں اپنے سامنے بٹھائے بناء تعطل دیکھ سکتا ہوں۔ تمہاری ہر بات۔۔۔۔ ایک ایک لفظ۔۔۔ آنے والے ہر دن سننے کی تمنا رکھتا ہوں۔ تمہارے ہنسنے پہ جو دونوں گالوں میں گڑھے پڑتے ہیں انکی گہرائی سے لے کر تمہاری خفگی سے ماتھے پڑنے والی لکیروں کی تعداد تک زبانی یاد ہے مجھے۔" آگے بڑھ کر اپنی انگلی سے اس کے گال کو چھوا تو صلہ کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی محسوس ہوئی تھی۔ وہ سر تا پاء کانپ کر رہ گئی۔

"ثمر بھائی آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟" وہ چند قدم پیچھے ہوتی ثمر سے کچھ اور فاصلے پہ جا کھڑی ہوئی۔ ماضی میں ہوئی ذو معنی باتوں اور اس کی بے پناہ توجہ کے پیچھے چھپی اس کی سوچ صلہ پہ پہلی بار آشکار ہو رہی تھی۔

"یہی کہ میں بس تمہیں پڑھائی میں ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا ورنہ دل تو کچھ ایسی بغاوت پہ اترا ہے کہ تم سے ایک دن بھی دور رہنا منظور نہیں۔ پھر بھی میری ٹریننگ ختم ہونے کے بعد امی ہمارے رشتے کی بات ماموں سے کریں گیں۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہو گا ناصلہ؟ صلہ نے نچلا لب کاٹتے بے یقینی سے ثمر کو دیکھا۔ وہ اب بھی گہری نظروں سے اسی کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک صلہ نے نگاہیں جھکا دیں اور نفی میں گردن ہلاتی بھاگتی ہوئی اسٹیج کی طرف چلی گئی۔ پیچھے ثمر مسرور سا اسے دیکھتا رہا۔

اس کا ارادہ آج ہی یہ خوشخبری فارینہ کو سنانے کا تھا۔

☆☆☆

رات بھر وحشت اس کے گرد ہالہ بنائے طواف کرتی رہی۔ نیند اس دور دراز وادی کا نام تھا جہاں تک پہنچنے سے پہلے روح شل اور ذہن بوجھل ہو جاتا پھر ہی وہ چند گھڑیاں سو پاتی اور وقت کے ساتھ ساتھ یہ دورانیہ قلیل تر ہوتا جا رہا تھا یہاں تک کہ اب نیند کی گولیاں بھی اثر کرنا چھوڑ چکی تھیں۔ صبح ہونے تک اس کے اعصاب اتنی بری طرح چیخ رہے تھے کہ لگتا تھا دم گھٹ جائے گا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ علی الصبح ڈاکٹر کے پاس چل پڑی تھی۔

"کہاں چلنا ہے بی بی؟" سیاہ شیشوں والی گاڑی سے کمر ٹکائے فلک شیر نے اسے بلند دروازے سے نکلتے دیکھا تو مستعدی سے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول دیا۔ رانیہ بلا توقف گاڑی میں بیٹھ گئی تو فلک شیر نے بھی فوراً ہی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور پھر گاڑی کے بیک ویو مرر میں دیکھتے سوال کیا۔

"ڈاکٹر کے پاس چلو"۔ سر سے پاؤں تک خود کو ایک بہت بڑی سفید چادر میں لپیٹے اسے وہ کوئی کفن زدہ لاش محسوس ہوتی تھی۔ فلک شیر نے آج تک اس کا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ کہ چادر کے کونے سے اس نے ہمیشہ اپنا چہرہ چھپایا ہوتا تھا۔ بس اس کی آنکھیں تھیں جہاں دنیا جہان کی وحشت اور بے سکونی چیخ چیخ کر اس کے خالی پن کا ماتم کرتی تھی سو آج بھی ان بھوری آنکھوں میں اسی ویرانی کا راج تھا۔ رانیہ گاڑی کی سیٹ سے سر ٹکائے اس کی موجودگی سے لاتعلق اپنی ہی سوچوں میں گم بیٹھی تھی۔ فلک شیر نے خاموشی سے گاڑی چلا دی کہ وہ اب منزل سے واقف تھا پر اتنا تو وہ بھی جانتا تھا جس مرض کی دوا لینے وہ جا رہی ہے اس کا علاج کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں ہے۔

روح کے زخم اور تنہائی کے گھاؤ کا مداوا سکون آور گولیوں سے نہیں ہوا کرتا۔

☆☆☆

"یہ بھابھی کہاں گئی ہیں"۔ تبریز نے ناشتے کی میز پہ رانیہ کو نا پا کر سوال کیا تھا۔

"ڈاکٹر سے دوا لینے گئی ہیں"۔ قدسیہ اماں نے کپ میں چائے انڈیلتے عام سے لہجے میں کہا تو اسے تعجب ہوا کیونکہ کل تک تو بظاہر وہ ٹھیک ہی تھی۔

"کیا ہوا ان کی طبیعت کو؟" چائے کا کپ لبوں سے لگاتے اس نے ایک بار پھر سوال کیا۔ اس بار لہجے میں تشویش تھی۔

"جوانی کی بیوگی کیا کوئی کم روگ ہوتا ہے بیٹا۔" قدسیہ نے ایک لمبی سرد آہ بھرتے کہا۔ تبریز لب بھینچے خاموش رہا۔

"جی اچھا نہیں تھا بہو کا کل سے۔ دوا لے آئے گیں تو سکون ہو جائے گا"۔ اسے خاموش پا کر قدسیہ نے مزید کہا اور واپس باورچی خانے کی طرف چلی گئی پر پیچھے تبریز گہری سوچ میں ڈوبا قدسیہ اماں کی بات کا مفہوم جان چکا تھا۔ جانتا تھا تنہائی سے بڑا عذاب اور اپنی گھٹن زدہ زندگی میں قیدِ تنہائی کاٹنے سے بڑی مشقت اور کیا ہو گی۔ زندہ در گور ہونے والوں کی اذیت کیا ہوتی ہے اس کا اندازہ تھا اسے شائد اسی لئے وہ کل رانیہ کے اس مضحکہ خیز سلوک کے باوجود اسے ٹوک نہیں پایا تھا۔ سمجھا نہیں سکا تھا کہ اس کا غم بہر حال کم نا تھا۔

رانیہ کی روح کے زخم محسوس کرنے کے بعد اس سے دوسرا لقمہ اٹھایا نہیں گیا تھا۔ وہ ناشتہ یونہی چھوڑ کر ڈیرے کی طرف نکل آیا جہاں بہت دنوں بعد اس کے والد سردار محسن علی براجمان ہوئے تھے۔ اس کی آمد کا اثر تھا یا پھر ڈاکٹری دواؤں کا کرشمہ ان کی طبیعت اب بہتر تھی بس کھانسی شدید تر تھی اور وہ تو کچھ وقت میں ہی جانی تھی۔ بہت سے کام ان کی بیماری کی وجہ سے موخر تھے لہذا آج وہ صبح ہی ڈیرے پہ نکل آئے تھے۔ یہ ڈیرہ دراصل ان کے بڑے سے گھر کے احاطہ میں ہی بنا ہوا تھا مگر مرکزی حصے سے کچھ فاصلے پر۔ تبریز بھی ان کے پاس وہیں آ گیا تھا۔ لوگوں کی آمد و رفت ہمیشہ کی طرح آج بھی جاری تھی۔ وہ بیٹھے حساب کتاب دیکھ رہے تھے۔ تبریز کو وہاں دیکھ کر بے اختیار خوش ہو گئے۔ اس نے انہیں اچھے موڈ میں دیکھا تو کچھ سوچتے ہوئے سوال کیا۔

"بابا ایک بات کہوں؟" انہوں نے مسکرا کر سر ہلاتے اجازت دی تو تبریز ذہن میں وہ لفظ تولنے لگا جن سے ان کے سامنے اسے اپنا مدعا بیان کرنا تھا۔ ان کے سامنے ان کے مزاج کے خلاف بات کرنا آسان نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا سردار صاحب کی ضد چٹان سی ہے توانا پہاڑ پھر بھی دل میں ایک موہوم سی امید تھی کہ شائد اس بار وہ انہیں موم کر پائے۔ ان ماہ و سال کی جدائی اور ڈھلتی عمر نے ان کی سوچ میں دراڑ ڈال ہی دی ہو۔

"باپ کو چھوڑ کے جانے کے سوا کچھ بھی کہہ دو شہزادے"۔ انہوں نے اسے اپنا کل والا وعدہ یاد دلایا تھا کہ وہ اب گھر چھوڑ کر واپس نہیں جائے گا۔ انہین اس عمر میں تنہا نہیں چھوڑے گا۔ تبریز نے ان کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھتے یقین دہانی کرائی۔ ان کی اس بات کے بعد تبریز کے لئے اب ان سے اپنے دل کی بات کہنا آسان ہو رہا تھا۔

"آپ کو نہیں لگتا ہمیں رانیہ بھابھی کی شادی کر دینی چاہیئے؟" بہت سوچ کر اس نے بالآخر کہہ ڈالا تھا۔ سردار صاب کے چہرے کا رنگ بدلا تھا۔

"فضول باتیں مت کرو تبریز"۔ اپنے غصے کو حد درجہ قابو میں رکھتے انہوں نے دھیمے لہجے میں اسے ٹوکا۔ وہ تلخ نہیں ہونا چاہتے تھے تو اس کی وجہ تبریز سے ان کے جڑے جذبات تھے کہ اب اسے ناراض کر کے خود سے دور کرنا تکلیف دہ تھا۔ یہ تو وہ خود چلا آیا ورنہ توانا کے پہاڑ پہ چڑھے محسن علی نے بیٹے کو ایک بار بھی واپس آنے کو نہیں کہا تھا پر ہاں اسے سامنے دیکھ کر ان کا دل پگھل گیا تھا۔ پھر بھی انہوں نے برجستہ اپنی ناپسندیدگی ظاہر کی تھی۔

"بابا اس میں فضول کیا ہے۔ یہ ان کا شرعی حق ہے۔ دین بھی اس بات کی اجازت دیتا ہے۔ اور پھر ان کی عمر ہی کیا ہے"۔ اس کا انداز التجائیہ تھا۔ سردار صاحب کے گھٹنے پہ دھرے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ کر اس نے جیسے انہیں پرسکون کرنے کی کوشش کی تھی پر انہوں نے بے ساختہ اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"مجھے مت سکھاؤ دین۔ رسم ورواج اور خاندانی تقدس بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ ہمارے گھر کی بہو بیٹیاں دوسری شادیاں نہیں کرتیں۔ اس عمر میں سردار محسن علی کا منہ کالا کروانے کا کوئی دوسرا طریقہ نہیں ملا تھا تمہیں۔" وہ حد درجہ سنجیدہ شکایت بھرے لہجے میں بولے۔ ابھی کچھ دیر پہلے والا لاڈ ختم ہو چکا تھا اور ایک بار پھر سردار محسن علی اس کے سامنے اپنے پورے تفاخر سے کھڑا تھا جس کے اپنے تراشیدہ اصول اور ضابطے تھے۔ جس کی سوچ فقط اس کی اپنی ذات تھی اور اس ذات نے کبھی اس سے منسلک لوگوں کی خوشیوں کے متعلق نہیں سوچا تھا۔ تبریز کو گہرا رنج ہوا۔ یعنی اتنے برسوں ان سمیت اس گھر کے ہر فرد نے جو اذیت کاٹی تو کیا کسی ایک کو بھی رہائی نا ملے گی؟

"یہ کیسے رواج ہیں بابا جو ایک انسان کا استحصال کرنا تو جانتے ہیں لیکن اسے جینے کا حق نہیں دیتے۔ کیا آپ جانتے ہیں رانیہ بھابھی ایک عرصہ سے اینٹی ڈپریسنٹ لے رہی ہیں۔ اپنی صحت برباد کر لی ہے انہوں نے بابا اور آپ ۔۔۔۔" وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔ اب ایسا تو نہیں تھا سردار صاحب خود ان باتوں سے بے خبر ہوتے آخر اسے دو دن میں یہ سب معلوم ہو چکا تھا تو وہ تو اتنے سالوں سے ان کے ساتھ ایک ہی چھت تلے رہ رہی تھی۔ پھر کیا اس کے ادھورے پن کی خبر انہیں نہیں تھی۔

"کس چیز کی کمی ہے رانیہ کو اس گھر میں۔ اچھے برے کا کل اختیار اس کے پاس ہے۔ عیش سے رہتی ہے حق سے جیتی ہے۔ تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے وہ اس گھر کی ملازمہ ہے"۔ سردار صاحب کا لہجہ اس بار سنجیدہ تھا پر وہ غصے مین نہیں تھے۔ شائد وہ اپنے رویے سے تبریز کو ایک بار پھر بد گمان نہیں کرنا چاہتے تھے اس لئے مناسب انداز میں اس کا دھیان ان مثبت پہلوؤں کی طرف دلایا۔ اچانک تبریز کا ذہن ان کے جملے کے آخری لفظوں میں اٹک گیا تھا۔ "گھر کی ملازمہ"۔ وہیں بیٹھے بیٹھے ذہن کے پردوں پہ سیاہ لباس میں ملبوس ایک بے تاثر اور خاموش چہرہ نمودار ہوا تھا جس کی سیاہ آنکھیں اس پل چیخ چیخ کر ایک ہی سوال کر رہی تھیں کہ غاصب کی زبان سے حق کی بات اچھی نہیں لگا کرتی۔ مٹھیاں بھینچے وہ یکدم وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا۔ سمجھ ہی نہیں آئی سردار صاحب سے مزید کیا بات کرے اس لئے بناء کچھ کہے خاموشی سے اٹھ کر باہر چلا گیا۔

"اتنی عمر ہو گئی لیکن اس کا جذباتی انداز نہیں بدلا۔ اسے رانیہ کا استحصال نظر آرہا ہے۔ عقل کا اندھا یہ نہیں دیکھ رہا دو سو مربے اور شمشیر کے نام کی آدھی جائیداد رانیہ کی ہے۔ اسے بیاہ کر خود کنگال ہو جاؤں۔ ہونہہ"۔ سردار صاحب سر جھکائے رجسٹر کھولے ایک بار پھر حساب کتاب دیکھنے لگے تھے۔

اندر داخل ہوتے فلک شیر نے ان کی بڑبڑاہٹ سنی تھی۔ وہ ابھی رانیہ کو ڈاکٹر کے پاس سے لے کر واپس لوٹا تھا۔ لب بھینچے اس نے تاسف سے سر جھٹکتے اس دنیا کی سب سے کنگال عورت کے حال پہ افسوس کیا تھا کہ جس کے اپنے ہی اس کی زندگی میں موجود عذاب کا موجب ہیں۔

☆☆☆

سردار محسن علی نا صرف علاقے کی جانی مانی شخصیت بلکہ نہایت با اختیار جاگیر دار تھے۔ میلوں پھیلی جاگیریں اور علاقے کے لوگوں کی ان کے سامنے جھکی گردنیں ان کے اونچے حسب نسب کی چغلی کھاتی تھیں۔ سردار صاحب کے دو بیٹے تھے۔ بڑا بیٹا شمشیر جس کی شادی ابھی چند روز پہلے سردار صاحب نے اپنے مرحوم بھائی کی اکلوتی کم سن بیٹی رانیہ سے کی تھی، مزاج کا تیز اور آوارہ طبیعت کا حامل تھا۔ الٹے دوستوں کی صحبت اور مال کی بہتات کا نشہ بڑے بڑوں کو عیب دار کر دیتا ہے۔ شمشیر کا شمار بھی کچھ ایسے ہی لوگوں میں ہوتا تھا۔ اس کا زیادہ وقت عیش و نشاط میں گزرتا۔ شادی بیاہ کے جھنجھٹ میں وہ فی الحال اس لئے بھی پڑنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ ایک تو اسے ابھی کوئی ذمہ داری نہیں اٹھانی تھی دوسرے رانیہ میں اسے رتی بھر دلچسپی نا تھی۔ کچھ عمر بھی اس کی زیادہ نہیں تھی اس پہ وہ ایک شریف النفس اور سادہ مزاج کی خاندانی لڑکی تھی جبکہ شمشیر کا دل بازاری اور پیشہ ور عورتوں کے فریب کی طرف مائل تھا ایسے میں اسے بس سردار صاحب کا حکم مان کر رانیہ کو اپنے شریکِ حیات کے روپ میں قبول کرنا پڑا تھا کیونکہ اس کے پاس انکار کی گنجائش نہیں تھی۔

سردار محسن علی کا رعب و دبدبہ اولاد پہ بھی اپنی رعایا جیسا تھا البتہ وہ ان کی عیاشیوں کو نظر انداز کر دیتے تھے۔ رانیہ کی شمشیر سے شادی ان کا فیصلہ تھا جس میں کسی صورت ردوبدل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ سردار صاحب کو بھتیجی سے زیادہ اس کی لمبی چوڑی جائیداد میں دلچسپی تھی جو اس کی کہیں اور شادی کی صورت خاندان سے باہر چلی جاتی اسی لئے تو سردار صاحب نے یتیم بھتیجی کو بہو بنا کر دنیا کی نظروں میں احسانِ عظیم کیا تھا پر یہ تو وہی جانتے تھے اس احسان کے پیچھے ان کی کون سی جعلسازی چھپی ہوئی تھی۔

"سردار صاحب میں تو کہتا ہوں اس بار آپ بھی الیکشن میں کھڑے ہو ہی جائیں۔" وہ حسبِ معمول اس وقت اپنے ڈیرے پہ بیٹھے تھے۔ چاپلوس اور چمچہ گیروں کا پورا گروہ ان کے گن گانے میں مصروف تھا اور سردار محسن علی کی تنی ہوئی گردن کا سریہ کچھ اور اکڑ رہا تھا۔

"نیت تو میری بھی بہت تھی کمال دین۔ اب دیکھو نا علاقے میں پچھلے دنوں اتنے کام کروائے، یتیم خانہ بنوایا، بیوا اور غریب لڑکیوں کی شادی پہ جہیز کا بندوبست کیا، پانی کا مسئلہ حل کرایا۔ اب ان سارے کمی کمینوں کے لئے اتنا کچھ کیا تو کیا ووٹ نہیں ڈالیں گے مجھے"۔ ان کے لہجے میں کھلی حقارت اور تحقیر تھی۔ ارد گرد بیٹھے لوگوں کی گردنیں سردار صاحب کے غرور کی تاب نالا کر مزید جھکی تھیں۔ بااختیار اسی لئے طاقت ور اور ظالم بن جاتے ہیں کیونکہ ان کے سامنے اکثریت اپنی کمزوری اور مظلومیت کو قبول کر لیتی ہے۔ ان کی حاکمیت کو مان کر انہیں اپنا ناخدا تسلیم کر لیا جاتا ہے۔

"تو پھر سردار صاحب مسئلہ کیا ہے"۔ کمال دین نے سردار محسن علی کے پیر دباتے سوال کیا۔

"یار یہ بی اے پاس والی شرط رکھ کر میری تو امیدوں پہ ٹھنڈا پانی ڈال دیا ہے۔ چلو کوئی نہیں میں نا سہی میرا تبریز تو دیتے فخریہ انداز میں کہا۔ تبریز کے ذکر پہ ہمیشہ کھڑا ہو سکتا ہے نا الیکشن میں"۔ سردار صاحب نے مونچھوں کو تاؤ ہی ان کے لہجے میں احساسِ تفاخر نمودار ہو جاتا تھا۔

"کیوں نہیں سردار صاحب اپنا تبریز باؤ تو ایم اے پاس ہے۔ اسمبلی میں کیا ہی گردن اکڑا کے جائے گا۔ بس آپ اپنی پارٹی بنا ہی ڈالیں۔ اسپورٹر اکٹھے کرنا ہمارا کام"۔ کمال دین نے سردار صاحب کی ہاں میں ہاں ملاتے اپنی بہترین چمچہ گیری کا ثبوت دیا تھا۔

"کیوں نہیں کیوں نہیں اس کے متعلق بھی فیصلہ کرتے ہیں"۔ سردار صاحب نے سر ہلاتے توثیق کی۔ اسی وقت تبریز ڈیرے میں داخل ہوا تو اسے دیکھ کر سردار صاحب کی باچھیں کھل گئیں۔

"آ میرے شیر، ابھی یہاں تمہاری ہی بات چل رہی تھی"۔ سردار صاحب نے اپنے نزدیک جگہ بناتے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"بابا مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے"۔ تبریز نے ڈیرے میں موجود لوگوں پہ نگاہ ڈالتے دھیمے لہجے میں کہا۔

"اچھا"! اس کی سنجیدگی نے سردار صاحب کو سوچ میں مبتلا کر دیا تھا۔ ایک دم ہی انہوں نے سب کو ڈیرے سے نکل جانے کا حکم دیا تھا۔

"اوئے کمال دین چلو تم سب باہر جا کر بیٹھو، میں ذرا تبریز پتر کی ضروری بات سن لوں"۔ سردار صاحب کی آواز سنتے ہی کمال دین سمیت سب لوگ سر جھکائے فرشی سلام کرتے باہر نکل گئے تھے۔

"ہاں بھئی بول کیا ضروری بات ہے۔پیسے ویسے چاہیئے ہیں کیا؟" سردار صاحب نے پاس بیٹھے تبریز کی پیٹھ ٹھونکتے پوچھا۔شمشیر کی نسبت ان کا چھوٹا بیٹا تبریز قدرے مختلف اور سلجھا ہوا انسان تھا۔یونیورسٹی میں پڑھنے کی وجہ سے وہ کافی عرصے سے شہر میں رہتا تھا۔اس کے عادات واطوار شمشیر ہی نہیں خود سردار صاحب سے بھی یکسر مختلف تھے جس کی بنیادی وجہ اس کا تعلیم کی طرف رجحان تھا۔اس کی سوچ اور شخصیت کی بدولت سردار محسن علی کو اس سے الگ سی انسیت تھی اور انہیں امید تھی مستقبل میں وہ ان کا درست جانشین ثابت ہو گا۔

"بابا مجھے آپ سے شمشیر بھائی کے بارے میں بات کرنی ہے"۔تبریز خاصا اپ سیٹ لگ رہا تھا۔

کیا ہوا شمشیر کو؟" وہ چونکے۔"

"شمشیر بھائی کی حرکتیں دن بہ دن مشکوک ہوتی جارہی ہیں بابا۔رانیہ بھابھی کی بھی انہیں کوئی پرواہ نہیں۔رات رات بھر وہ گھر سے غائب رہتے ہیں اور بھابھی ان کے انتظار میں پوری پوری رات روتی رہتی ہے"۔وہ ان دنوں گھر آیا ہوا تھا اور شمشیر کی روٹین سے نیا نیا آشکار ہو رہا تھا۔اس سے پہلے شمشیر کی حرکتوں کی خبر اس کے لئے سنی سنائی تھی پر اب جو کچھ اتنے دنوں سے چل رہا وہ اسے یکسر نظر انداز نہیں کر پایا تھا۔وہ بھی ایسے وقت جب اس کی شادی کو محض چند روز ہوئے ہوں۔

"تو اس میں اتنا پریشان ہونے والی کیا بات ہے بھلا۔ دوستوں یاروں میں بیٹھے وقت کا پتا کہاں چلتا ہے"۔ سردار صاحب اس کی بات کا مطلب اچھی طرح سمجھتے تھے لیکن اس کی توقع کے برخلاف انہوں نے اس بات پہ انتہائی ہلکا ردِ عمل ظاہر کیا تھا۔ وہ حیران پریشان باپ کی شکل دیکھنے لگا۔

"اوہ بیٹا جی تم پریشان مت ہو اس عمر میں میں بھی ایسا ہی تھا"۔ اسے اپنی طرف حیرت سے دیکھتا پا کر سردار محسن علی انتہائی بھونڈے انداز میں ہنستے ہوئے اسے اپنی جوانی کی داستانیں سنانے لگا جن کا ذکر اصولاً تو کسی بھی شریف انسان کے لئے اپنی جوان اولاد کے سامنے قابلِ تحقیر و شرمندگی ہی ہوا کرتا ہے۔ تبریز کو ان کی ایسی سوچ نے تکلیف دی تھی۔ اس کا تو خیال تھا سردار صاحب بھتیجی کے حق کی خاطر بیٹے کو سرزنش کریں گے پر یہاں تو سب الٹا ہو گیا تھا۔

"بابا رانیہ بھابھی سے ہمارا ایک اور بھی رشتہ ہے۔ ان کے ساتھ جو زیادتی ہو رہی ہے آپ کو اس پہ شمشیر بھائی کو منع کرنا چاہیئے الٹا آپ ان کی غلط حرکتوں کو جسٹفائی کر رہے ہیں"۔ وہ اپنی ناامیدی کا اظہار کئے بناء نہیں رہ پایا تھا۔ سردار صاحب نے اس کی بات کو سرے سے کوئی اہمیت دی ہی نہیں تھی۔

تبریز بوجھل دل کے ساتھ وہاں سے واپس شہر لوٹ گیا تھا۔

☆☆☆

گھر کا ماحول بدلا تھا رانیہ کی زندگی۔ شمشیر کے ساتھ تو وہ جیسے مسکرانا ہی بھول گئی تھی۔ اس کی زندگی میں کوئی ایک صبح ایسی نہیں آئی تھی جب اس کا شوہر اس کے پہلو میں ہو۔ وہ راتیں جاگتی، تنہا اس ویران کمرے کی چھت کو تکتی شمشیر کی راہ دیکھتی۔ وہ دن چڑھے اس کی آنکھوں کی لالی کو نظر انداز کرتا کمرے مین لڑکھڑاتے ہوئے پاؤں رکھتا اور پھر سو جاتا۔ رانیہ کی ماں تھی نا ساس، بہن تھی نا نند۔۔۔ وہ اپنا حالِ دل کسے سناتی۔ اپنی تشنگی کسے بتاتی کہ سہاگن ہو کر بھی اس کی زندگی بیواوں سے بدتر تھی۔ پھر بھی ہر دن ایک امید لئے شروع ہوتا کہ شائد آج اس کے مقدر کا ستارہ چمک اٹھے اور وہ اپنے شوہر کی نظروں میں سرخرو ہو پائے۔ پر ایسی صبح شمشیر کی زندگی مین رانیہ کے لئے کبھی نہیں آ سکی۔

سردار صاحب کی شدید ترین خواہش ہونے کے باوجود بھی تبریز نے الیکشن میں ان کی جگہ کھڑے ہونے سے صاف انکار کر دیا۔ اس کا رجحان کبھی بھی سیاست کی طرف نہیں تھا نا ہی وہ سردار صاحب کی سوچ کی عکاسی کرتے ہوئے ان کا مہرہ بن کر ان کی نمائندگی کرنا چاہتا تھا۔ سردار صاحب جو اپنے تئیں سیاست میں اینٹری مارنے کے سارے انتظامات مکمل کر چکے تھے تبریز کے انکار پر شدید برہم ہو گئے۔ دوسری طرف تبریز نے امتحانات کے بعد شہر ہی میں ایک مقامی اکیڈمی میں پڑھانا شروع کر دیا۔ آنے والے دنوں میں اسے پوری امید تھی کہ اسے کالج میں لیکچرار شپ مل جائے گی۔ اس حرکت نے سردار صاحب کے غصے کو دوگنا کر دیا اور انہوں نے تبریز کو واضح تنبیہہ کرتے اپنی جائیداد سے عاق کرنے کی دھمکی دے دی پر انہی دنوں ایک ایسا واقعہ رونما ہوا کہ سردار صاحب کی ساری توجہ تبریز سے ہٹ کر دوسری طرف منتقل ہو گئی۔

اسمبلی ممبران کے لئے بی اے پاس ہونے کی شرط ختم کر دی گئی تھی اور سردار صاحب بطور آزاد امیدوار اپنے علاقے کے لئے الیکشن ٹکٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ ہر طرف بڑے زور و شور سے الیکشن کی تیاریاں کی جا رہی تھیں اور سردار صاحب کو قوی امید تھی کہ وہ یہ سیٹ لازمی جیت جائیں گے۔

☆☆☆

صلہ نے فیروز کی تلاش میں کالج کے گیٹ سے سر باہر نکالا اور پھر کلائی پہ بندھی اپنی گھڑی مین وقت دیکھتے دل ہی دل میں اس لیٹ لطیف کو کوسا تھا۔ آج تو تقریباً سارا کالج ہی خالی ہو چکا تھا۔ کچھ سوچتے ہوئے اس نے اپنا سفید دوپٹہ سلیقے سے سر پہ اوڑھا اور کالج کے گیٹ سے باہر چلی آئی۔ گیٹ کیپر کو اپنے بھائی کے لئے پیغام دے کر وہ تیز قدموں سے چلتی سڑک تک آ پہنچی تا کہ وہاں سے کوئی بس یا رکشہ لے کر گھر چلی جائے۔ جب سے فارینہ کی شادی ہوئی تھی صلہ اس کی کمی شدت سے محسوس کرتی تھی۔ ویسے تو وہ اس سے سینئیر تھی مگر چھٹی کا وقت تو ایک ہی تھا۔ اس سے پہلے کبھی ایسی سچویشن آڑے آتی تو وہ فارینہ کے ساتھ چلی جاتی۔ لیکن اب تو مجبوری تھی دل بڑا کر کے نکل ہی آئی۔

"ارے وہ دیکھ کیا زبردست آئٹم جا رہی ہے"۔ لڑکیوں کے کالج کے باہر وہ دونوں اپنی جیپ میں بیٹھے وہاں سے گزرتی لڑکیوں پہ آوازیں کس رہے تھے۔ ان دنوں یہ ان کا فیورٹ ٹائم پاس تھا۔ کبھی کبھار اس چکر میں کسی لڑکی سے ان کی دوستی بھی ہو جاتی تھی لیکن زیادہ تر تو جو تاد کھا کر آگے بڑھ جانے والوں میں سے تھیں۔ صلہ کو تنہا سڑک پار کرتے دیکھ کر شمشیر جیپ اس کے پیچھے لے آیا تھا۔

"چھوڑ یار یہ تو بچی ہے"۔یاور کچھ بد مزہ ہوا تھا۔

"ان بازاری دو نمبر لڑکیوں میں وہ بات کہاں جو اس ظالم حسینہ میں ہے"۔ہاتھ پہ ہاتھ مارتے اس نے چھچھورے انداز میں ساتھ بیٹھے یاور سے کہا تو اس کے حلق سے ایک فلک شگاف قہقہہ بلند ہوا تھا۔

"دل لے گئی۔۔۔ہائے دل لے گئی"۔صلہ کے نزدیک پہنچ کر شمشیر اب جیپ انتہائی کم رفتار پہ چلاتا اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ساتھ ساتھ بیہودہ گانے الاپتا اس کی توجہ حاصل کرنا چاہ رہا تھا۔

"شٹ اپ۔راستہ چھوڑو میرا ورنہ ابھی سب کو اکٹھا کر کے تمہیں جوتے پڑواؤں گی"۔صلہ کوئی عام لڑکی نہیں تھی جو ان اوچھی حرکتوں پہ ڈر جاتی۔وہیں کھڑے کھڑے اس نے سڑک پہ پڑا پتھر اٹھا لیا تھا۔

"تیور بھی شعلے اگل رہیں ہیں روپ کی طرح۔بھئی ہم تو اک نگاہِ یار سے ہی جل کر بھسم ہو گئے"۔شمشیر یکدم جیپ روک کر نیچے اتر آیا۔صلہ تو اسے سڑک چھاپ غنڈہ سمجھ رہی تھی پر وہ آوارہ اور گھاک تھا اس کے لئے اس کی دھمکی کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔کمالِ اعتماد سے اس نے ایک جھٹکے سے صلہ کے ہاتھ سے پتھر پکڑ کر نیچے پھینکا اور اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔

"ہاتھ چھوڑو میرا ورنہ اچھا نہیں ہو گا۔تم جانتے نہیں میں کون ہوں"۔وہ غصے سے تلملاتی چلائی تھی۔ساتھ ہی ارد گرد نگاہ کی جہاں دوپہر کے اس پل بس اکا دکا لوگ ہی موجود تھے۔زندگی میں پہلی بار تھا کہ وہ اکیلی باہر نکلی تھی

اور اس پہ یہ افتاد، اس کا دل اب پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ دیر ہو جانے کے باعث کالج کی سبھی لڑکیاں جا چکی تھیں۔

"شمشیر جب کسی کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے تو اتنی آسانی سے نہیں چھوڑتا"۔ شمشیر نے اسے خود سے قریب کرتے کان میں سرگوشی کی تھی۔

"بدتمیز انسان تہذیب تو تمہیں چھو کر نہیں گزری میں کہتی ہوں۔۔۔۔" صلہ نے اسے پرے دھکیلنا چاہا پر شمشیر اس سے بھی پہلے اسے جیپ میں ڈال چکا تھا۔ یاور نے دوسری طرف سے اس کے ہاتھ پکڑے۔ شمشیر اچک کر جیپ میں بیٹھا لیکن اسی وقت فیروز کی گاڑی وہاں آ کر رکی تھی۔

"تمہاری ہمت کیسے ہوئی میری بہن کو ہاتھ لگانے کی"۔ غصے میں آگ بگولا ہوتا فیروز شمشیر کی طرف لپکا اور آن کی آن میں اس کا گریبان تھامے اسے جیپ سے نیچے کھینچ لیا۔ صلہ جو چیخ و پکار کرتی مدد کی طلبگار تھی فیروز کو وہاں دیکھ کر پرسکون ہوئی لیکن اب بھی وہ یاور کی گرفت میں تھی۔

"ارے واہ۔۔۔ ہیرو!" شمشیر دونوں ہاتھ جھاڑتا فیروز کی طرف بڑھا اور اسے ایک زوردار مکا جڑ دیا۔ فیروز تلملا کر نیچے گرا تھا۔

"میں کہتا ہوں چھوڑ کمینے ورنہ میں تیرا خون پی جاؤں گا"۔ تیزی سے اٹھتے اب وہ جیپ میں بیٹھے یاور کی طرف بڑھا تھا جس کی گرفت میں صلہ بے بس ہو رہی تھی۔ یاور کے سر پہ اپنا سر مارتے اس نے ایک ہی وار میں یاور کو بے حال کر دیا تھا۔ صلہ جلدی سے جیپ سے اتری اور فیروز کی اوٹ میں جا پہنچی۔

"مر گئے شمشیر کو دھمکانے والے۔ تو چوزہ مارے گا مجھے"۔ شمشیر نے اس پہ گرفت مضبوط کی پر اچانک فیروز نے اپنا ریوالور نکالا اور شمشیر پہ تان لیا۔ شمشیر کی تو جان ہی نکل گئی تھی۔ فیروز کی آنکھیں اس پل شعلے اگل رہی تھیں۔ ریوالر فیروز کے ہاتھ مین دیکھ کر یاور تو اسی وقت بھاگ گیا خود شمشیر کی بھی سٹی گم ہو گئی تھی۔ وہ اب رفتہ رفتہ اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ شمشیر کے سر پہ پہنچ کر فیروز نے ٹریگر دبایا۔ شمشیر لپک کر اس کے ساتھ گتھم گتھا ہو گیا اور پھر اچانک گولی چلنے کی آواز سے فضا گونج اٹھی تھی۔

"فیروز بھائی۔۔۔۔۔"صلہ سڑک پہ بیہوش ہو کر گرنے سے قبل حلق کے بل چلائی تھی۔

رفتہ رفتہ اس کی نظروں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

☆☆☆

سڑک کے بیچوں بیچ ہوئے اس جھگڑے میں فیروز کے پستول نکال لینے کی وجہ سے ہاتھا پائی خونریزی میں بدل گئی تھی۔ ریوالور سے چلنے والی تینوں گولیاں شمشیر کے جسم میں پیوست ہو گئیں اور زخموں کی تاب نالا کر وہ موقع پہ ہی ہلاک ہو گیا تھا۔ صلہ اس واقعے کی چشمدید گواہ تھی تو جھگڑے کی بنیادی وجہ بھی وہی تھی۔ دونوں گھروں میں

صفِ ماتم بچھی تھیں۔ سردار محسن علی گر اکلوتے بیٹے کی لاش کو گلے سے لگائے رویا تھا تو رفیق احمد اکلوتے بیٹے کے ہاتھوں میں ڈلی ہتھکڑی دیکھ کر سینہ پیٹ رہا تھا۔ محسن علی اب فقط جاگیر دار نا تھا بلکہ ایک سیاسی شخصیت بن چکا تھا۔ اس کے غمگساروں اور آگ مین تیل ڈالنے والوں کی تعداد زیادہ تھی کہ نقصان تو بہر حال اس کا ہوا تھا۔ رانیہ تو جیسے بت بنی اپنی تباہی پہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ ارد گرد بیٹھی عورتوں نے اس کی چوڑیاں اتارتے جس طرح شمشیر کے کردار کی دھجیاں اڑائیں اس نے حرف با حرف وہ لمحات اپنی اس شادی شدہ زندگی مین جیئے تھے۔ وہ ہر گز ایک اچھا شوہر نہیں تھا بلکہ شائد وہ تو ایک اچھا انسان بھی نہیں تھا لیکن رانیہ کو اس کی موت سے درد ہوا تھا۔ وہ ہر صبح اٹھ کر اس کے دل میں اپنے لئے محبت کی دعا مانگا کرتی تھی کہ کسی نا کسی دن قدرت کو اس کے حال پہ رحم آجائے گا اور پھر اپنی اس دعا کی طاقت کے بل بوتے پر رات تک شمشیر کی بے حسی جھیلا کرتی تھی پر آج کے بعد وہ صبح پھر کبھی نہیں آنی تھی جس میں رانیہ کے اندر شوہر سے محبت کی خواہش دعا بن کر لبوں پہ آتی۔ تین روزہ سوگ ختم ہوا تو پرسا دینے والوں کی آمد و رفت بھی کم ہوئی۔ رانیہ کی زندگی اس دن بس ایک ہی نقطے پہ مرکوز ہو گئی اس بات سے بے خبر کہ ڈیرے پہ ان دنوں کون سے نئے جوڑ توڑ کئے جا رہے ہیں۔ یہ مردوں کی دنیا تھی اور یہاں مردوں کا راج، عورتوں کی زندگیاں تو محض گھروں کی چار دیواری تک محدود تھیں۔

"ہمیں تم سے پوری ہمدردی ہے سردار محسن علی۔ بات اگر عدالتوں تک پہنچی تو بدنامی تمہارے حصے بھی آئے گی۔"

"اکبر خان، شمشیر کی تعزیت کرنے آیا تو ایک نئی داستان چھیڑ بیٹھا۔ سردار محسن بھرا بیٹھا تھا تو دوسری طرف رفیق احمد اپنی سر توڑ کوشش کر رہا تھا کہ فیروز کو سزا سے بچا لیا جائے۔ اس سلسلے میں وہ کسی بھی حد تک جانے کو تیار

تھا کیونکہ روزینہ بیگم نے بیٹے کے غم میں زمین آسمان ایک کر رکھا تھا۔ اکبر خان، سردار صاحب کا پرانا دوست تھا اور ان کا ہم پلہ بھی۔ رفیق احمد نے اس سلسلے میں اکبر خان کو انوالو کیا تھا تاکہ وہ سردار کے غصے کو کم کرتے اس کے بیٹے کو موت کی سزا سے بچا لے۔

"تو کیا اس خوف سے میں اپنے جوان بیٹے کا خون معاف کر دوں؟" سردار صاحب ایک دم ہتھے سے اکھڑ گئے تھے۔

"معاملہ ان کے بھی اکلوتے جوان بیٹے کا ہے سردار۔ اور تمہارا بیٹا ان کی بیٹی سے زیادتی کر رہا تھا۔ غیرت میں آکر فیروز نے یہ قتل کر دیا۔ اختیارات ان کے بھی کچھ کم نہیں۔ پھر عدالتوں میں ایسے کیس سالوں چلتے ہیں ہاتھ کسی کے کچھ نہیں آتا"۔ اکبر خان ذہنی طور پہ اس ردِ عمل کے لئے تیار تھا۔ ان کی پیٹھ تھپتھپاتے تسلی دیتے اس نے آئینے کا دوسرا رخ دکھایا۔

"تم کہنا کیا چاہتے ہو اکبر خان کھل کے بات کرو"۔ سردار محسن علی سیانا آدمی تھا اتنا تو جانتا تھا اکبر خان یونہی بک بک نہیں کر رہا۔ ظاہر ہے کوئی بھی واقعہ ایسے ہی وقوع پذیر نہیں ہو جاتا۔ حقیقت کسی سے چھپی تو نہیں تھی اس پہ اگر آدھے لوگ سردار کے ساتھ تھے تو ہمدردیاں فیروز کے لئے بھی کم نہیں تھیں۔

"دیکھو میں تمہارا دوست ہوں اور تمہارے غم میں برابر کا شریک ہوں۔ میری تو یہی خواہش ہے تمہارا بھلا ہو جائے۔" اکبر خان نے ان کے ہاتھ پہ اپنے ہاتھ کا دباؤ بڑھاتے پراسرار انداز میں کہا۔ سردار محسن علی کے ماتھے کے بل گہرے ہوئے تھے پر اتنے سال جاگیرداری کے بعد انہوں نے حالیہ سیاست میں ایک بات سیکھی تھی کہ

فائدے والی بات بھلے کتنی تلخ ہی کیوں نا ہو کڑوی گولی کی طرح نگل جانی چاہیئے کیونکہ بہر حال اسی میں آپ کی بھلائی پوشیدہ ہوتی ہے۔

"اور وہ کیسے ؟؟؟؟" انداز گوا کھڑا ہوا اور کچھ کچھ طنزیہ تھا پر سردار محسن علی کو بھی تجسس ہو رہا تھا کہ آخر اکبر خان کون سی نئی تجویز لے کر ان کے پاس آیا ہے۔

"اسی لڑکی سے تمہاری شادی کرا دیتے ہیں۔ مشکل سے پندرہ سولہ سال عمر ہو گی۔ ساتھ میں کئی سو مربے جہیز لائے گی۔ اسے کہتے ہیں چوپڑی بھی اور دو دو۔ ارے بھئی وہی تو تھی نا فساد کی جڑ"۔ اکبر خان نے بیہودہ ہنسی ہنستے پاس بیٹھے سردار صاحب کی کمر میں ٹھوکا مارا۔ دراصل یہ تجویز بھی اسی کی تھی۔ رفیق احمد کو تو ہر حال میں بیٹا قانون کی گرفت سے باہر چاہیئے تھا۔ اس نے اکبر خان کا دامن پکڑ لیا جس پہ اکبر خان نے اسے ونی کی صورت اس مشکل سے نکلنے کی راہ دکھائی تھی۔ گو امر تکلیف دہ تھا کہ رفیق احمد کو بیٹی بھی بے حد عزیز تھی لیکن جوان بیٹے سے بڑھ کر نہیں تھی۔ پھر شادی تو کر رہے تھے کون سا اسے فیروز کی طرح قبر میں اتارنا تھا۔ یہی سوچ کر اس نے اپنے دل کو تسلی دی تھی کہ وارث کھو کر خود کو جیتے جی مارنے کی سکت نہیں تھی اس میں ہاں پر بیٹی کو اس کے متبادل زندہ در گور کیا جا سکتا تھا۔

"ارے یار اس عمر میں شادی کر کے میں کیا کروں گا۔ ویسے بھی تمہیں تو معلوم ہے میں الیکشن لڑنے والا ہوں۔ ان حالات میں ایک بچی سے شادی والا معاملہ۔۔۔ بات کچھ جمی نہیں"۔ سردار محسن علی کھسیانی ہنسی ہنستا یوں شرمایا

جیسے وہ واقعی دولہا بنا ہوا ہے لیکن سیاست میں ایسی باتیں آپ کی پوزیشن پہ منفی اثرات ڈالتی ہیں تو یہاں وہ مجبور تھا لیکن زمین کا ذکر سن کر اس کی رال ٹپکنے لگی تھی

"اچھا تو پھر تبریز سے شادی کرا دیتے ہیں۔ جائیداد تو تمہارے ہاتھ ہی آئے گی نا۔ کہو کیا خیال ہے؟" اکبر خان نے کچھ سوچتے ہوئے مشورہ دیا۔ سردار محسن علی کا مان جانا اس کی جیت تھی۔ آخر وہ بھی تو رفیق احمد کو زبان دے کر آیا تھا۔ بہر حال وہ اب خاصا مطمعن تھا کیونکہ سردار محسن علی پہ جائیداد والا جادو چل گیا تھا۔

"اچھا خیال ہے۔ اس کے متعلق سوچا جا سکتا ہے۔ ویسے وہ ونی کے لئے مانے گا نہیں۔ یہ آجکل کے بچوں کا پڑھائی لکھائی نے دماغ خراب کر دیا ہے"۔ تبریز کو منانا آسان نا تھا اور یہ بات سردار محسن کو اندر ہی اندر پریشان کر رہی تھی۔ اب تک تو وہ اسی بات پہ مطمعن تھا کہ تبریز واپس آ چکا تھا اور شمشیر کے کیس کی پیروی وہی کر رہا تھا۔ سردار صاحب کو اس کا بڑا آسرا تھا لیکن ظاہر سی بات ہے یہ ایسی عام سی بات تو تھی نہیں جس پہ وہ ہنسی خوشی رضامند ہو جاتا۔

"میں نے تمہارے فائدے کی بات کی ہے۔ اب تبریز کو راضی کرنا تمہارا کام ہے۔ دیکھو لڑکی کو بھیڑ بکری بنا کر کہیں بھی ڈال دینا۔" اکبر خان نے مکاری سے کہا اور سردار صاحب کے چہرے پہ پر سوچ خاموشی نے ڈیرے ڈال لئے۔

"چلو سوچتا ہوں اس کے بارے میں"۔ سوچنا تو تھا ہی انہیں اس متعلق۔ اب شمشیر کا قتل ہونے کی وجہ سامنے آنے کی صورت ان کی عزت کا جنازہ تو پہلے ہی نکل چکا تھا رہی سہی کسر عدالتوں میں کیس چلنے سے پوری ہو جاتی۔ اس سب میں محسن علی کی آنکھوں کے سامنے یہ الیکشن تو ویسے بھی ہاتھ سے نکل ہی رہا تھا۔

بہر حال انہیں کسی نا کسی طرح تبریز کو اس شادی کے لئے راضی کرنا ہی تھا۔

☆☆☆

"ان لوگوں کا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ فیروز کے گناہ بخشوانے کے لئے یہ صلہ کی زندگی کو بھینٹ چڑھائیں گے"۔ ثمر وہیں بیٹھے بیٹھے پھنکارا تھا۔ اس نے حالیہ صورتحال جاننے کی خاطر گھر فون کیا تھا جب ذکیہ بیگم نے اسے یہ تازہ خبر سنائی۔ اس کا خون کھولنے لگا تھا یہ بات سننے کے بعد۔ وہ بھی اس صورت جب وہ صلہ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔

"میں کرتا ہوں بات ماموں جان سے بلکہ میں خود وہاں آرہا ہوں"۔ بھاڑ میں جائے ٹریننگ اس نے فوری فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ جو دن گن گن گزار رہا تھا کہ کب یہ ٹریننگ پوری ہو اور ماں کو صلہ کا ہاتھ مانگنے بھیجے۔ پر یہاں تو اس سے پہلے ایک نئی مصیبت آن پڑی تھی۔ روزینہ بیگم جہاں بیٹے کے لئے مری جا رہی تھیں تو بیٹی کا سوچ کر بھی دل ہول رہا تھا پر یہاں تو قدرت نے اپنا کرم اس طرح کر دیا کہ بوڑھے سردار محسن علی کی بجائے ان کے پڑھے لکھے خوبرو

اور جوان بیٹے سے شادی کی جا رہی تھی۔ دشمنی کی بھینٹ معصوم بیٹی کو چڑھائے جانے کا قلق کچھ تو کم ہوا ہی تھا لیکن ثمر کے دماغ میں تو دھماکے ہو رہے تھے۔

"کوئی ضرورت نہیں تمہیں اپنی ٹریننگ کے دوران یہاں واپس آنے کی۔ جو جیسے چل رہا ہے اسے ویسے ہی چلنے دو" ۔ماں کی بات پہ اسے یقین نہیں آیا تھا۔ ان کا لہجہ بے حد نارمل تھا جیسے یہ کوئی بڑا مسئلہ ہو ہی نا۔

"امی یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ آپ بھول گئیں کیا میں صلہ سے۔۔۔۔؟؟؟" اسے شاک لگا تھا۔ وہ تو سمجھا تھا اس بات کے بعد اس کی طرح ماں بھی کرب سے گزر رہی ہو گی۔ آخر وہ روزِ اول سے بیٹے کی تمنا جانتی تھیں پھر خود وہ بھی تو دل و جان سے صلہ کو بہو بنانے کی تمنائی تھیں۔ کیسے وہ اس کے ارمانوں کا خون ہونے دے سکتی ہیں۔

"بھول تو تم رہے ہو کہ فارینہ تمہاری بہن ہے اور فیروز اس کا شوہر۔ فیروز کو اگر کچھ ہو گیا تو فارینہ کا کیا ہو گا یہ سوچا ہے تم نے۔ اور پھر جو کچھ ہوا صلہ کی وجہ سے ہی ہوا۔ فیروز نے تو بس وہ کیا جو کوئی بھی غیرت مند بھائی ایسے وقت مین کر گزرتا"۔ اسے ماں کی خود غرضی سے دکھ پہنچا تھا۔ تو وہ مقولہ کہ بیٹیاں تو سب کی سانجھی ہوتی ہیں فقط کتابی و فلسفیانہ بات تھی۔ سچائی تو یہ ہے کہ دوسروں کی بیٹیاں سب سے ارزاں اور بے مول ہوا کرتی ہیں۔ پھر جب اس کے اپنے والدین اس معصوم پہ بیٹے کو ترجیح دے رہے تھے تو وہ بھلا پھوپھی ہو کر کیوں اسے بچاتیں۔

"پر اس سب میں صلہ کا کیا قصور ہے امی"۔ وہ پوچھے بناء رہ نا پایا۔

"ایسے معاملے یک طرفہ نہیں ہوا کرتے ثمر۔۔۔۔فارینہ بھی تو چار سال سے کالج جا رہی ہے۔اس سے پہلے تو کبھی دیکھا نا سنا کہ کالج کے باہر کوئی واقعہ ہوا ہو۔جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے اس لڑکی کو کالج جاتے اور اس کے عاشق بن گئے۔تو اب بھگتے اپنی کرنی کو۔"اسے اندازہ نہیں تھا اس کی ماں کی سوچ اتنی سطحی ہو سکتی ہے۔

"صلہ ایسی لڑکی نہیں ہے امی۔وہ تو بہت معصوم ہے ان سب باتوں کے مفہوم بھی نہیں جانتی"۔اس نے فی الفور صلہ کا دفاع کیا تھا۔

"کون کیسا ہے کیسا نہیں تمہیں ابھی اس کی کیا پہچان۔میں نے دنیا دیکھی ہے اور تم یہ صلہ کی طرفداری بند کرو۔ابھی کوئی تعلق نہیں بنا تو ماں کو باتیں سنا رہے ہو کل کو بیاہ ہو جاتا تو مجھے تو نکال باہر کرنا تھا تم نے اس کے چکر میں۔اب تو میں کسی صورت اس لڑکی کو بہو بنانے کا تصور نہیں کر سکتی"۔وہ تیز لہجے میں کہتیں اسے شرمندہ کر گئی تھیں۔اس کا دل عجب مخمصے کا شکار ہوا تھا۔ایک طرف ماں کا حکم تھا تو دوسری طرف دل۔ایک طرف حق تھا تو دوسری طرف رشتے اور پھر رشتے جیت گئے تھے۔

"اور ہاں وہ وہ لوگ جلد ہی صلہ کا نکاح کر رہے ہیں۔اس دوران تمہیں بالکل یہاں آنے کی ضرورت نہیں۔راضی نامہ تو ہو چکا ہے بس اب اللہ کرے فیروز جلد گھر لوٹ آئے میری بچی کا تو رو رو کے برا حال ہو گیا ہے۔"اس خبر کے ساتھ اپنا حکم دوٹوک انداز میں سناتے انہوں نے لائن کاٹ دی تھی۔

ثمر نے چپ چاپ فون میز پہ رکھتے ہوئے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

☆☆☆

شمشیر کی موت کی خبر تبریز کے لئے بھی بے تحاشہ تکلیف دہ تھی۔ وہ اس کا بڑا بھائی تھا۔ بھلے اس کی عادات سے تبریز کو اختلاف تھا پر وہ اس سے محبت کرتا تھا۔ اس کی موت کی وجہ سے بھی بہر حال وہ واقف تھا اور اس بات کا اسے بے حد رنج تھا لیکن اس سب کے باوجود وہ فیروز کو سزا دلوانا چاہتا تھا۔ اس کیس کی پیروی وہی کر رہا تھا لیکن اچانک اسے سردار محسن علی نے اس معاملے کو ختم کرنے کا حکم دیا تو وہ حیرت زدہ ان کی صورت دیکھنے لگا۔ پر جب اصل بات سامنے آئی تو وہ ہوش ہی کھو بیٹھا تھا۔

"کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ بابا؟ اپنے بھائی کے خونِ ناحق کے بدلے ان کی نابالغ بیٹی سے شادی کر لوں کیونکہ اس کے بدلے وہاں سے کئی سو مربے جہیز ملے گا۔ آپ نے یہ بات سوچی بھی کیسے؟ اور پھر ہمیں کس چیز کی کمی ہے جو ہم جائیداد کے لئے یہ سب کریں۔" تبریز کا ردِ عمل وہی تھا جو سردار صاحب پہلے سے سوچ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ذہنی طور پہ اسے ہر طرح قائل کرنے کو تیار تھے۔ تبریز کے لئے یہ ناممکنات میں سے تھا۔ وہ فیروز کو معاف کر بھی دیتا تو ہرگز اس کی بہن سے شادی نہیں کر سکتا تھا۔

"اوہ بیٹا جی ہولے۔۔۔۔ ٹھنڈے دماغ سے کام لیتے ہیں۔" سردار صاحب کا رویہ اتنا ہی نارمل تھا جیسے یہ بات اب ایشو ہو ہی نا۔ وہ اکبر خان کو زبان دے چکے تھے اور اکبر خان رفیق احمد کو اطمینان دلا چکا تھا۔ بالا ہی بالا معافی نامہ طے پا چکا تھا۔

"ان عدالتوں میں انصاف ملتا نہیں بلکہ بکتا ہے۔ فیروز کو پھانسی لگ بھی گئی تو شمشیر نے واپس نہیں آجانا۔" محسن علی کے لہجے میں چھپا اطمینان اسے حیران کر رہا تھا۔ اس سے پہلے تو وہ خود اس کیس کو عدالت تک لے جانے کی سر توڑ کوشش کر رہے تھے اور اب اچانک انہیں اس سسٹم سے انصاف کی امید ہی نہیں رہی تھی۔ ظاہر سی بات ہے اب آنکھوں کے سامنے دو سو مربے اور لاکھوں کے زیورات کی چمک نے بینائی جو سلب کر لی تھی۔

"لیکن اس طرح گناہ گار کو مواخذہ کے بغیر چھوڑ دینے سے تو جرم مزید بڑھے گا۔ میں جانتا ہوں شمشیر بھائی کی بھی غلطی بلکہ گناہ تھا لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں اسے قتل کر دیا جاتا"۔ اس نے انہیں تحمل سے سمجھانے کی کوشش کی۔

"الیکشن ہونے والے ہیں تبریز، ان حالات میں شمشیر کے کردار کے بخیے ادھیڑے گئے تو اس کے چھینٹے مجھ تک بھی پہنچیں گے۔ بیٹا تو چلا گیا اب تم کیا چاہتے ہو رہی سہی عزت بھی چلی جائے"۔ ان کا لہجہ دوٹوک تھا۔ روکھائی سے کہتے انہوں نے سرد نگاہوں سے تبریز کی طرف دیکھا۔ وہ فیصلہ کر چکے تھے اور اب اس میں کسی ردوبدل کی گنجائش نا تھی۔

"لیکن میں شادی نہیں کروں گا"۔ تبریز نے احتجاج کیا تھا۔ بہر حال یہ اس کا حق تھا پھر دیتے پھریں سردار صاحب دشمنوں کو معافی لیکن اس کے عویض وہ ہر گز ایسی گری ہوئی حرکت نہین کر سکتا تھا جس کے بعد خود سے نظریں ملانے کے قابل بھی نا رہتا۔

"تو مت کرو۔ بھائی کی قبر پہ مٹی ڈالنے تو آ گئے تھے باپ کے جنازے کو کندھا دینے مت آنا۔ تمہارے لئے اصول اہم ہیں نا تو سردار محسن علی کو اپنی زبان اپنا وعدہ عزیز ہے۔ میں معافی نامہ اکبر خان کو دے چکا ہوں لہذا وہ لڑکی اس گھر میں بیاہ کر آئے گی۔ تم نہیں کرو گے یہ شادی تو میں کروں گا۔ سردار محسن علی نے اپنے ترکش سے وہ آخری تیر نکالا تھا جس کے ذریعے انہیں تبریز سے یہ جنگ جیتنی تھی۔ یہ تو ان کے دل کی بات تھی کہ انہیں دوسری شادی نہیں کرنی کیونکہ ان کے حواسوں پہ الیکشن سوار تھا پر تبریز کو تو ایسا کچھ علم نا تھا۔ جتنا وہ تبریز کو سمجھتے تھے وہ جن اصولوں کے پیچھے لگ کر اس رشتے سے انکار کر رہا ہے ان میں سب سے پہلے انسانیت آتی ہے۔ وہ باپ کو کبھی ایک کم سن لڑکی کی زندگی برباد کرنے نہیں دے گا۔ اسی لئے انہوں نے تبریز کو بلیک میل کرنے کی خاطر یہ جھوٹ بولا پر دل میں ان کا ایسا کوئی قصد نہ تھا۔

تبریز واقعی ہل گیا تھا۔

☆☆☆

والدین کی جذباتی بلیک میلنگ میں ہار ہمیشہ اولاد کے اصول جاتے ہیں سو وہ بھی ہار گیا تھا۔ اس کے ضمیر کو یہ سب گوارہ نہیں تھا لیکن ایک بڑی زیادتی سے بچانے کی خاطر اس نے صلہ سے نکاح کر لیا تھا۔ وہ ذہنی طور پہ اس رشتے کو قبول کرنے کے لئے تیار تھا نا ہی اس صورتحال میں صلہ سے کوئی تعلق قائم رکھ سکتا تھا۔ پھر یہ بھی سردار صاحب کا فیصلہ تھا کہ وہ لڑکی اس گھر میں رانیہ کے مقام پہ نہیں رہ سکتی۔ اتنے بہت سے مسائل میں تبریز کو فقط ایک حل نظر آتا تھا اور وہ تھا اس ساری صورتحال سے فرار۔ نکاح کے فوراً بعد وہ شہر چلا گیا تھا کبھی نا لوٹ کے

آنے کے لئے مگر تقدیر میں کچھ اور ہی لکھا تھا جو ہر بار ہمارے فیصلوں پہ غالب آجاتا ہے۔ پچھلے دنوں موسم میں تبدیلی کا اثر تھا یا شائد بڑھتی عمر کا تقاضا، سردار محسن علی کی طبیعت بہت زیادہ بگڑ گئی تھی۔ رانیہ انہیں اس طرح بستر پہ پڑا دیکھ کر شدید پریشان ہو گئی تھی اور اسی گھبراہٹ میں روتے ہوئے اسے فون کر دیا۔ برسوں بعد گھر سے بلاوا آیا تو وہ بھی باپ کی تکلیف کا سن کر جذباتی ہو گیا تھا۔ گھر مین کبھی دوبارہ پیر نا ڈالنے کے سب دعوے رانیہ کی درخواست اور آنسوؤں میں بہہ گئے تھے۔ بالآخر وہ لوٹ آیا پر جس ایک بات کو بھلانے کے لئے اس نے اتنے سالوں کا بنواس کاٹا تھا یہاں پہنچ کر وہ حقیقت کی صورت جوں کی توں اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کی بیوی جسے اس نے کبھی ذہن و دل سے قبول نہیں کیا تھا آج بھی اس گھر میں موجود تھی۔ مگر کس حیثیت سے؟؟؟؟ وہ جب سے آیا تھا اسے ایک ملازمہ کی طرح کام کرتے دیکھ رہا تھا۔ پھر رانیہ اور سردار صاحب کا اس کے ساتھ ذلت آمیز رویہ جو اس گھر میں کسی عام ملازم کے ساتھ بھی نہیں تھا تو فقط اس لئے کہ وہ شمشیر کے قاتل کی بہن تھی۔ رانیہ کو اسے دیکھ کر ہر لمحہ اپنی تہی دامنی یاد آتی تھی۔ اپنا خسارہ وہ اس لئے بھی بھول نہیں پاتی تھی کیونکہ صلہ اس گھر میں موجود تھی۔ کچھ یہی وجوہات تھیں جو وہ یہ شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اپنے سے کئی سال چھوٹی اور نابالغ لڑکی سے اس کے بھائی کے گناہ کے بدلے شادی کے بعد یہاں کوئی بھی خوش نہیں رہنے والا تھا اور آج یہی سب تو ہو رہا تھا۔ وہاں رانیہ کا ماتم سالوں بعد بھی جاری تھا تو ادھر صلہ اس گناہ کی سزا کاٹ رہی تھی جو اس نے کیا ہی نہیں تھا اور تبریز۔۔۔۔۔ وہ جانے کس جرم کی پاداش اس قید میں ڈالا گیا تھا۔

شہر میں کئی بار اس نے سوچا کہ اس اذیت اور تنہائی سے نجات پانے کی خاطر اسے اپنا گھر بسالینا چاہیئے۔ وہ عمر کے اس حصے میں تھا جہاں جذبات سے بڑھ کر ضرورت آڑے آجاتی ہے۔ اسے بھی اپنا گھر، جیون ساتھی اور اولاد کی ضرورت تھی جن سے وہ اپنی تنہائی بانٹ پاتا۔ پھر اسے تو سردار صاحب نے اس شادی سے پہلے ہی یہ کہہ دیا تھا کہ وہ جب چاہے اپنی پسند اور مرضی سے شادی کر سکتا ہے۔ اس کی بیوی کو سارے حقوق اور احترام ملیں گے جو اس خاندان کی بہو کا حق ہیں لیکن وہ ہر بار یہ فیصلہ کرنے میں ناکام رہا۔ ایک احساسِ ندامت تھا جو ہر

بار راستے میں آجاتا اور وہ دوبارہ شادی کرنے کی سوچ کو رد کرتا اپنی روٹین کی زندگی گزارتا رہتا۔ ایک بار ایک بڑی برائی کو روکنے کی خاطر وہ یہ غلطی کر بیٹھا تھا اب اس کی زندگی میں مزید کسی غلطی کی گنجائش نہیں تھی۔ لیکن ماضی جوں کا توں سامنے تھا۔ ایک طرف رانیہ کا غم تو دوسری طرف صلہ۔۔۔۔۔ اسے ان دونوں کے ساتھ ہو رہی زیادتی کا ادراک تھا اور وہ ان دونوں کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

اس وقت رانیہ کو بھول کر وہ صلہ کے متعلق سوچنے لگا تھا جو اپنوں کی بے رحمی کا شکار ہو کر یہ اذیت بھرا وقت گزار رہی تھی۔ ماضی کی انہی تلخ سوچوں میں گھرا وہ اپنے ہی دھیان میں مگن لان میں چہل قدمی کرتا گھر کی پچھلی طرف پہنچ گیا۔ یہاں قطار در قطار ملازموں کے کوارٹر بنے ہوئے تھے جہاں چند ملازمین اور ان کے بیوی بچے رہتے تھے۔ کمروں کے باہر سیمنٹ کا چبوترہ بنا تھا جہاں ایک دو کرسیاں اور ایک چارپائی پڑی تھی۔ دن چڑھ چکا تھا اور گھر کے اس حصے میں اس وقت خاصی چہل پہل تھی۔ درمیان میں ایک کچا احاطہ تھا جس میں موسمی سبزیاں اور چند پھلوں، پھولوں کے درخت تھے۔ وہیں ملازموں کے بچے بچیاں کھیل کود رہے تھے۔ اچانک اسے اپنے عالشان

گھر کے سناٹے کا خیال آیا جہاں کسی کو سانس بھی اپنی مرضی سے لینے کی اجازت ہے نا ہی مسکرانے کی اس کے برعکس ان عام سے لوگوں کے چہروں پہ نظر آتا ہر تاثر کتنا فطری ہے۔ پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالے وہ لان کے کونے سے کھڑا بچوں کی شرارتیں دیکھتا محظوظ ہوتا رہا۔ اتفاق سے یہاں کھڑا کوئی شخص اسے دکھ نہیں سکتا تھا پر وہ پورے احاطے کو بآسانی دیکھ پا رہا تھا۔ اسی وقت سامنے کے ایک کمرے سے صلہ نکل کر سیمنٹ والے چبوترے پہ آکر بیٹھ گئی۔ وہی کل والا سیاہ لباس جو بری طرح گھسا ہوا اپنا رنگ اور چمک بھی کھو چکا تھا۔ سر پہ سیاہ دوپٹہ اوڑھے اس نے خود کو اچھی طرح لپیٹ رکھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی بچے بھاگ کر اس کے پاس چلے آئے۔ صلہ نے ہاتھ میں ایک ٹوکری پکڑی ہوئی تھی۔ ایک بچی وہ پلاسٹک کی ٹوکری لے کر کیاری مین چلی گئی اور وہاں لگے موتیے کے جھاڑوں سے پھول چن چن کر ٹوکری میں بھرنے لگی۔ باقی اپنے کمرے سے قاعدہ اٹھا لائے اور صلہ سے پڑھنے بیٹھ گئے۔ تبریز چاہ کر بھی واپس نا لوٹ پایا۔ بچی پھولوں سے بھری ٹوکری صلہ کے پاس رکھ کر اب خود بھی اپنا سبق اسے سنانے لگی تھی۔ صلہ نے ٹوکری میں رکھے پھولوں کو دھاگے میں پرو کر بڑی نفاست سے چند گجرے بنائے اس دوران وہ سب بچوں کو پڑھا بھی رہی تھی۔

یہ پہلا موقع تھا جب تبریز نے اسے پورے دھیان سے دیکھا۔ اس کی دودھیا رنگت سورج کی کرنوں میں سنہری دکھائی دے رہی تھی۔ اس معمولی لباس میں بھی اس کا روپ توجہ بٹورتا تھا گو کپڑے ارزاں تھے پر وہ بقیہ ملازمین کے برعکس صاف ستھری تھی۔ کچھ دیر تک پڑھائی کا یہ سلسلہ جاری رہا اور اس دوران ٹوکری کے سارے پھول لڑیوں کی صورت پروئے جا چکے تھے۔ بچے اٹھنے لگے تو صلہ نے وہ سارے گجرے انہیں بانٹ دیئے اور خود

مسکراتی ہوئی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ پلٹ کر کمرے میں جاتے اچانک اس کی نگاہ لان کی طرف کھڑے تبریز پہ پڑی تو وہ ٹھٹک گئی۔ وہ جو ارد گرد سے بے نیاز گہری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا اچانک اسے اپنی طرف متوجہ پا کر خجل ہوا۔ صلہ کے چہرے کی مسکراہٹ تو اسے دیکھتے ہی سمٹ چکی تھی۔ بے اختیار اس نے اپنے سر سے کھسکتا دوپٹہ درست کیا اور سر جھکائے کمرے کے اندر چلی گئی۔

تبریز چند منٹ وہیں سر جھکائے خالی ذہن کے ساتھ کھڑا رہا اور پھر آہستہ آہستہ چلتا واپس گھر میں داخل ہو گیا۔

☆☆☆

صبح کی طرح رات کے کھانے پر بھی رانیہ ان کے ساتھ موجود نا تھی البتہ سردار صاحب آج بہت دن بعد اپنے کمرے کی بجائے ڈائننگ روم میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ ان کے لئے صلہ نے ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق پرہیزی کھانا الگ سے تیار کیا تھا۔ وہ خاموشی سے ٹیبل پہ کھانا رکھ کر اب باورچی خانے سے میٹھے کی ڈش اٹھانے گئی تھی۔ تبریز نے کرسی پہ بیٹھتے اک نگاہ اس پہ ڈالی۔ صلہ دیکھ کر بھی بے تاثر چہرے کے ساتھ اپنے کام میں مگن رہی۔ اس کے دل کا بوجھ اور بھی بڑھ گیا تھا۔ شائد اسے واپس آنا ہی نہیں چاہیئے تھا۔ وہاں تو بس احساسِ ندامت تھا پر یہاں جیتے جاگتے ظلم آنکھوں کے سامنے نظر آ رہے تھے۔ صلہ کے ساتھ ہو رہی زیادتی ہی کیا کم تھی جو رانیہ پہ ناد کھائی دینے والا جبر سوچ کر اسے اس وقت اپنے آپ سے بھی نفرت ہو رہی تھی کہ وہ کسی کے لئے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

"میں نے بہت سوچا، میرا خیال ہے تمہاری بات درست ہے مجھے رانیہ کی شادی کر دینی چاہیئے"۔ سردار صاحب نے سوپ کا باؤل ختم کرتے اسے پرے کھسکایا۔ تبریز نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ وہ کھانا کھا تارک گیا تھا۔

"سچ بابا؟" اسے واقعی یقین نہیں آرہا تھا کیونکہ اس سے پہلے بھی وہ اپنی ناراضی وضد جتا کر ان سے اپنی کوئی بات منوا نہیں سکا تھا۔ تو کیا ان کے اندر بھی تبدیلی آرہی تھی۔ شائد ایک بیٹا کھو کر دوسرے بیٹے کی طویل جدائی نے انہیں پہلے کی طرح مضبوط نہیں رہنے دیا اسی لئے تو وہ اس کی بات مان گئے۔

"آپ واقعی ان کی شادی کر دیں گے؟" تبریز نے ان کا چہرہ دیکھتے تصدیق چاہی تھی۔ جواب میں انہوں نے نیپکن سے منہ پوچھتے سر ہلایا اور پھر اپنی پلیٹ میں کھانا ڈالنے لگے۔ تبریز اب بھی ان کو دیکھتا ان کی اگلی بات کا منتظر تھا۔

"رانیہ میرے مرحوم بھائی کی بیٹی ہے۔ میرے دل ٹکڑا ہے اور میرے لئے بالکل ویسی ہے جیسے میری اپنی اولاد۔ شمشیر سے اس کی شادی تو۔۔۔۔" وہ کہتے کہتے رک گئے۔ شمشیر کا ذکر اس پل کرب بن کر چہرے پہ نمودار ہوا تھا۔

"خیر تم نے ٹھیک کہا تھا۔ زندگی اور خوشیوں پہ اس کا بھی پورا حق ہے۔" ایک گہری سانس لیتے انہوں نے سلسلہِ کلام ایک بار پھر شروع کیا اور تبریز کے اندر ابھی کچھ دیر پہلی والی پشیمانی دم توڑنے لگی۔ رانیہ سے اس کا دوہرا رشتہ تھا۔ تمام عمر وہ لوگ ایک ہی گھر میں رہے۔ پھر اس کی شادی بھی یہیں ہو گئی تو جیسے رشتہ مزید گہرا ہو گیا۔ رانیہ اور تبریز ہم عمر تھے پر وہ اسے شمشیر سے رشتے کی وجہ سے آج بھی بھابھی کہہ کر مخاطب کرتا تھا اور دل سے اس کی

خوشیوں کا تمنائی تھا۔ وہ گواہ تھا کہ رانیہ نے شادی کے بعد کتنی تکالیف اٹھائی ہیں اور وہ سلسہ اب بھی کہاں ختم ہوا تھا کہ گھٹ گھٹ کر جیئے جانا زندگی تو نہیں ہوتی۔

"تھینک گاڈ آپ کو میری بات سمجھ آگئی۔ ویسے کوئی اچھا رشتہ ہے آپ کی نظر میں"۔ وہ ایکدم بے تحاشہ خوش ہو گیا تھا۔ کھانے کا نوالہ منہ میں ڈالتے اس نے صلہ کے ہاتھ کا ذائقہ محسوس کیا۔ اس کی بھوک چمک اٹھی تھی۔

"رشتے کے لئے کہیں باہر جانے کیا ضرورت ہے۔ گھر کی بات ہے گھر میں ہی رہنی چاہیئے۔" اس کے برعکس سردار صاحب کے چہرے پہ معنی خیز سنجیدگی تھی۔

"میں آپ کی بات سمجھا نہیں بابا۔ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟" تبریز نے ذہن پہ زور ڈالتے ان تمام تر ممکنات کے متعلق سوچا تھا۔ ان کی برادری، دور نزدیک کے رشتے داروں میں سے کون ایسا ہو سکتا تھا جو ان کے گھر کا فرد تھا یا جسے اس کے بابا گھر کا سمجھتے تھے۔ ماتھا کھجاتے اس نے سوال کیا۔ اسی وقت سامنے باروچی خانے سے صلہ کھیر کا باؤل تھامے باہر آئی۔ تبریز کی نگاہ اپنے آپ اس پہ جا ٹھہری۔

"میں چاہتا ہوں رانیہ سے تم شادی کر لو"۔ کھیر کا باؤل رانیہ کے ہاتھ سے گر کر چکنا چور ہو گیا تھا۔ تبریز بے یقینی سے سردار صاحب کا منہ دیکھنے لگا پر وہ خونخوار نگاہوں سے صلہ کی طرف متوجہ تھے جو افراتفری میں اب کانچ کے ٹکڑے سمیٹ رہی تھی۔

"اے لڑکی! تو یہاں کیا کر رہی ہے۔ چل بھاگ یہاں سے۔۔۔۔" سر ادر صاحب کی آواز سے خوفزدہ ہو کر وہ بری طرح کانپ گئی اور فرش پہ پڑے کانچ کی کرچیاں اس کے ہاتھ کو لہولہان کر گئی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے سنگِ مرمر کے فرش پہ گری کھیر کا دودھیا رنگ سرخ ہونے لگا تھا۔ صلہ آنکھوں میں خوف لئے سر دار صاحب کی آواز سن کر الٹے پاؤں باورچی خانے کی طرف واپس لوٹ گئی۔ تبریز نے دیکھا فرش پہ اس کے قدموں کے ساتھ انگلیوں سے ٹپکتے لہو کی لکیر بن چکی تھی۔ ایک لمحے کے لئے تاسف سے اس نے آنکھیں بھینچے لب کاٹا اور پھر بے حد روکھائی سے سر دار صاحب کی طرف متوجہ ہوا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ بابا۔ میں ان سے شادی کیسے کر سکتا ہوں؟" وہ بے ادب کبھی نہیں تھا پر ہاں تلخ ضرور ہوا تھا۔

"کیوں نہیں کر سکتے تم شادی رانیہ سے؟" سر دار صاحب معمول کے انداز میں بیٹھے کھانے کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔ یعنی ان کے نزدیک یہ سب اہمیت نہیں رکھتا تھا۔

"میں انہیں اپنی بہن سمجھتا ہوں۔ انہیں اس نگاہ سے دیکھنے کا تو تصور بھی نہیں کیا"۔ اس نے دفاعی انداز اختیار کیا۔ یوں بھی رانیہ کی دوسری شادی کی بات کرتے اس نے وہی سوچا تھا جو اس کا سگا بھائی سوچتا۔ پھر یہ اس کا حق بھی تھا پر ایسا تو اس کے وہم و گمان میں بھی نا تھا کہ بابا یہ ڈھول اسی کے گلے میں ڈال دیں گے۔

"اس وقت تو مجھے بڑی شرع سکھائی جا رہی تھی۔ رانیہ کو دوسری شادی کا حق مذہب نے دیا ہے تو کیا مذہب نے یہ نہیں کہا کہ بھائی فقط وہ ہوتا ہے جس سے خون کا تعلق ہو اور تمہارا رانیہ سے ایسا کوئی تعلق نہیں۔ اس سے تمہارا نکاح بالکل جائز ہے"۔ بڑے دوٹوک انداز میں کہتے وہ اسے اسی کی دلیل سے مات دے رہے تھے۔ تبریز کا دماغ گھوم گیا تھا۔

"بابا میں شادی شدہ ہوں"۔ اور یہ لفظ کہتے خود اس کا اپنا لہجہ اتنا مدہم تھا کہ بمشکل ہی اپنی کہی بات سن پایا۔ کیا مزاحمت تھی؟ وہ جسے برسوں سے کبھی آنکھ بھر بھی نہیں دیکھا تھا۔ جس کے وجود سے وہ اتنا لاپرواہ تھا کہ اس کی کوئی شبیہہ بھی ذہن کے پردوں پہ نا تھی۔ اس دن اگر قدسیہ اس کا تعارف نا کرواتی تو وہ اسے اپنے گھر کی کوئی ملازمہ ہی سمجھتا کہ اس سے بڑھ کر یہاں حیثیت ہی کیا تھی صلہ تھی۔ جس کا نام بھی یاد نہیں رہا تھا اس سے نام جڑنا یاد آ گیا تھا۔

"اس شادی کو میں مانتا ہوں نا ہی تم نے دل سے قبول کیا ہے۔ اس کی اوقات وہ ہے جس پہ اتنے سالوں سے اسے رکھا ہوا ہے اس لئے بھول جاؤ کہ تمہاری کوئی شادی ہوئی ہے اور جو میں کہہ رہا ہوں اس پہ دھیان دو۔ گھر کی بات گھر میں ہی رہ جائے تو عزت بھی بچی رہے گی اور جائیداد بھی"۔ سردار صاحب تیز لہجے میں کہتے اپنا مدعا بمعہ نئے حکم نامے کے سنا چکے تھے اور تبریز کو ان کی آخری بات یہ باور کرا چکی تھی کہ وہ یہ سب کچھ کس سوچ کے تحت کر رہے ہیں۔ انہیں رانیہ کی شادی سے کوئی مسئلہ نہیں، مسئلہ رانیہ کے نام کروڑوں کی جائیداد سے ہے جو اس کی شادی کی صورت اس کے ساتھ چلی جائے گی۔ وہ بیوگی کا کفن اوڑھے کسی زندہ لاش کی طرح اس گھر کے کونے

کونے میں ماتم کرتی پھرتی ہے تو کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہے کیونکہ اس طرح ساری جائیداد پہ سردار محسن علی کا قبضہ رہے گا۔ یہ دوسری بار اسے محسن علی کو اپنا باپ سوچ کر شرمندگی ہوئی تھی۔ پہلی بار جب اس نے ایک کم سن لڑکی سے خود شادی کرنے کی بات کی تھی کیونکہ تبریز اس وقت ان کے ذہن میں چل رہی سازش سے واقف نہیں تھا اور پھر صرف اس خوف سے کہ اس طرح صلہ کی زندگی برباد ہو جائے گی اس نے اس سے شادی کر لی تھی۔ یہ اور بات وہ اس تعلق کو نبھا نہ سکا اور اب رانیہ کے ساتھ کی جانے والی زیادتی۔۔۔ تو کیا اس بار بھی یہ طوق تبریز کو ہی پہننا ہو گا۔

سردار صاحب اٹھ کر جا چکے تھے۔ تبریز دونوں ہاتھوں سے سر تھامے اس نئی مصیبت کے متعلق سوچ رہا تھا۔ سامنے فرش پہ صلہ کے خون کے قطرے جم کر سیاہ ہو چکے تھے۔

☆☆☆

صلہ نے سنک کے سرد پانی تلے زخمی انگلیاں رکھ دیں۔ آن کی آن میں سنک ٹب میں بے رنگ پانی گلابی ہونے لگا۔ سردار صاحب کی آواز اب تک اسکے کانوں میں گرم سیسے کی طرح انگارے اگل رہی تھی۔ وہ کتنے بے رحم اور سفاک تھے یہ تو صلہ ان گزرے سالوں میں جان ہی چکی تھی پر ابھی ان کے ظلم کی حد باقی تھی یہ نہیں سوچا تھا۔ نل بند کر کے وہ اب دونوں ہاتھوں سے سنک تھامے سر جھکائے بری طرح رو رہی تھی۔ اپنی بے بسی پہ ماتم کر رہی تھی۔ پتا نہیں اس پل تکلیف زیادہ اس کے زخمی ہاتھ میں تھی یا دل میں۔ تبریز سے تو اسے کوئی امید نہیں تھی۔ اس کے دل میں اس رشتے کی بھلا کیا اہمیت۔ خود صلہ بھی کہاں اپنے آپ کو تبریز کے حوالے سے پہچانتی تھی۔ وہ

واقف تھی اپنی حیثیت سے، اسے پتا تھا اس گھر میں اس کا مقام۔۔۔۔ تبریز بھی تو اسے وہی سمجھتا تھا نا پھر جانے کیوں ایسا لگا تھا ایک ہی پل میں سب ختم ہو چکا ہے۔ اب کچھ نہیں بچا۔۔۔ وہ امید جو اس دن قدسیہ نے دلائی، گو صلہ نے اس کی بات کو رد کر دیا تھا پر دل کے نہاں خانوں میں آس نے سر اٹھایا تھا۔ لیکن آج تو وہ موہوم سی امید بھی دم توڑ گئی۔ وہ نہیں جانتی تھی تبریز نے باپ کو کیا جواب دیا پر اسے معلوم تھا سردار محسن علی کو انکار سننے کی عادت نہیں ہے۔ گر وہ یہ فیصلہ لے چکے ہیں تو جلد یا بدیر تبریز کو رانیہ سے شادی کرنی پڑے گی اور پھر اس کے بعد کیا ہو گا؟

تبریز پہلے اس کا تھا نا آج۔ وہ یہاں کل بھی غلام تھی، آج بھی اور آنے والے دنوں میں بھی وہ اس گھر کے لوگوں کی غلامی کرے گی پر اس سب کے ساتھ ایک نئی اذیت کا سامنا کرنا ہو گا صلہ کو۔۔۔۔۔ اپنے شوہر کو اس کی دوسری بیوی کے ساتھ زندگی گزارتے دیکھنا۔ آج تک رانیہ اس سے اپنے شوہر کے قاتل کی بہن کے روپ میں نفرت کرتی تھی۔۔۔ اسے دیکھتے ہی اس کا لہجہ زہر اگلنے لگتا تھا پر یہ رشتہ جڑنے کے بعد وہ صلہ سے سوتن بن کر انتقام لے گی۔

"افف"۔۔۔ سوچتے سوچتے اس کا دماغ شل ہو رہا تھا جیسے نل کے سرد پانی میں کچھ دیر رہنے کے بعد زخمی انگلیاں سن ہو گئی تھیں پر شکر کہ خون بہنا بند ہو چکا تھا البتہ زخموں کے نشان سے اب بھی ہلکا ہلکا لہو رِس رہا تھا۔ صلہ نے ایک نگاہ اپنے ہاتھ پہ ڈالی اور پھر سر جھٹکتے بے بسی سے اپنے دوپٹے کے پلو کو کس کر ہاتھ پہ باندھ لیا۔ اس سوچ کے ساتھ کھڑے رہنا دشوار تھا پر کام بھی تو ڈھیروں تھے سو معمول کے مطابق وہ کچن سمیٹنے لگ گئی۔ ڈائننگ ہال میں

اب کوئی نہیں تھا۔ میز صاف کر کے اس نے فرش صاف کیا اور پھر اپنے کوارٹر کی طرف جانے لگی کہ اچانک کسی کے زور سے گرنے کی آواز آئی تھی۔ گھر میں اس وقت موت سی خاموشی تھی کہ سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں جا چکے تھے۔ صلہ گھبرا کر اوپری منزل کی طرف بھاگی کہ یہ آواز اوپر کے حصے سے ہی آ رہی تھی۔ ہال سے نکل کر وہ رانیہ کے کمرے کی طرف بھاگی اور پھر اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔ رانیہ فرش پہ بے سدھ اوندھے منہ پڑی تھی۔

"رانیہ بھابھی اٹھیں"۔ صلہ نے جلدی سے اس کا سر اپنی گود میں رکھ کر اس کے گال تھپتھپانا شروع کئے۔ یقیناً یہ ان مسکن دواؤں کا اثر تھا جو رانیہ بے دریغ استعمال کر رہی تھی۔ اس سے پہلے بھی ایک دو بار وہ یونہی چکرا کر گر چکی تھی لیکن وہ یہ گولیاں کھانے سے باز نہیں آتی تھی۔ صلہ اس کے کمرے سے پانی کا گلاس لے آئی۔ چند چھینٹے اس کے منہ پر مارے اور پھر ہوش میں آنے پہ گلاس اس کے لبوں سے لگا دیا۔ رانیہ نے سارا پانی ایک ہی گھونٹ میں پی لیا۔ صلہ جانتی تھی وہ رات سے بھوکی بھی ہے کیونکہ کھانے کے لئے اس نے منع کر دیا تھا۔

"تم؟؟؟" وہ اب ہوش میں تھی۔ صلہ کی گود میں سر رکھے بمشکل آنکھیں کھولے وہ اسی کو دیکھ رہی تھی۔

"ہاں میں"۔ صلہ نے نرمی سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے کہا۔ اس پل وہ اسے بے حد قابلِ رحم محسوس ہو رہی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے والے احساسات غائب ہو چکے تھے۔ نا وہ شمشیر کی بیوہ تھی، نا ہونے والی سوتن۔۔۔۔ وہ تو بس ایک عورت تھی۔ اس کی طرح بے بس۔ مجبور۔ لاچار۔۔۔۔۔ جس کا فقط استحصال ہو رہا تھا۔

"آپ شائد نیند میں تھیں۔لائیں میں دوا لگا دوں"۔اس کے گال پہ گرنے کے باعث چوٹ لگی تھی۔ہلکا سا نیل کا نشان گلابی رنگت پہ نمایاں ہو رہا تھا۔صلہ نے وہاں انگلی پھیرتے محبت سے کہا۔رانیہ آہستہ سے اٹھ گئی۔صلہ نے اسے ہاتھ کا سہارا دیتے بیٹھنے میں مدد کی۔وہ دونوں اب وہیں آمنے سامنے فرش پہ بیٹھی تھیں۔سفید بیش قیمت اور نفیس جوڑے میں ملبوس اس گھر کی بڑی بہو رانیہ اور سیاہ بوسیدہ اور کم ترین لباس پہنے اس گھر کی چھوٹی بہو صلہ۔۔۔۔۔۔لباس کی قیمت اور رنگ زمین آسمان کے فرق سا ہونے کے باوجود ان دونوں کے چہرے اور آنکھیں ایک سی تھیں۔وہیں وحشت جو رانیہ کی آنکھوں میں تھی اتنا ہی درد صلہ کی نگاہوں میں دکھتا تھا۔رانیہ ایک ٹک صلہ کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔بے اختیار صلہ کو پلکیں جھکانی پڑیں۔اسے رانیہ کا یوں دیکھنا پریشان کر گیا تھا کہ اس سے پہلے تو رانیہ نے اسے کبھی ایسے نہیں دیکھا تھا تو کیا وہ بھی اس کی طرح سردار صاحب کی بات سن چکی ہے۔اس کو ایک نئی سوچ نے آگھیرا تھا۔

"تمہیں پتا ہے اکیلے ہونے کا عذاب کیا ہوتا ہے"۔وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی تو صلہ نے چونک کر سر اٹھایا۔صلہ خاموش رہی پر وجود کے ہر کونے سے ایک ہی جواب آیا تھا۔ہاں میں واقف ہوں اس درد سے۔۔۔۔ہجوم میں تنہا رہنا کیسا ہوتا ہے مجھے معلوم ہے اس کی اذیت۔

"تم تو جانتی ہو گی۔تم بھی تو بھگت رہی ہو"۔ایک توقف کے بعد اس کی طرف دیکھتے رانیہ نے خود ہی جواب دیا تھا ۔صلہ اب بھی خاموش رہی۔اس کے ہاتھ میں اب شدید درد ہو رہا تھا۔دھیان بار بار اس طرف منتقل ہو رہا تھا

کیونکہ دوپٹے میں بندھے ہاتھ کو گرمائی ملتے ہی احساسات لوٹ آئے تھے۔رانیہ کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ ابھری۔ صلہ کو یہ بے موقع ہنسی عجیب لگی تھی۔

"لیکن جانتی ہو میں اس جہنم میں کیوں ہوں صلہ؟" وہ ایک بار دھیمی آواز میں پوچھنے لگی۔صلہ کے سر پہ ٹکے دوپٹے پہ ہاتھ پھیرتے رانیہ نے کچھ انداز میں سوال کیا کہ صلہ کے اندر خوف کی لہر دوڑ گئی۔وہ ایک ٹک کسی مجسمے کی طرح بیٹھی رانیہ کو تک رہی تھی پر اس میں اتنی ہمت نا تھی کہ ایک انچ اپنی جگہ سے کھسک جائے۔

"کے سر پہ ٹکے اس کے ہاتھ نے صلہ کے بالوں کو مضبوطی سے اپنی گرفت میں لیا یون کہ اس کی چیخیں نکل گئیں۔ وہ بری طرح اس کے بالوں کو جکڑے اب دوسرے ہاتھ سے اس کا منہ نوچ رہی تھی۔

"تم اگر ہماری زندگی میں نا آتی تو میں یہ موت سے بدتر زندگی نا گزار رہی ہوتی"۔رانیہ نے بے تحاشہ اسے مارنا شروع کر دیا۔صلہ فرش پہ گری تڑپ رہی تھی اور رانیہ اسے ٹھڈے مار رہی تھی۔اس نے ایک بار بھی اس کا ہاتھ روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"رانیہ بھابھی چھوڑیں اسے"۔اچانک تبریز درمیان میں آ پہنچا اور اس نے رانیہ کو ایک جھٹکے سے پرے کیا تھا۔نیچے فرش پہ صلہ لہولہان نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑی تھی۔

"ہٹ جاؤ تبریز میں اسے جان سے مار دوں گی"۔وہ اپنے حواس میں نہیں تھی۔اس نے تبریز کو پیچھے دھکیلتے ایک بار پھر صلہ کو پاؤں مارا۔

"بس کریں۔ بہت ہو گیا تماشہ"۔ تبریز نے اس کے دونوں ہاتھوں کو سختی سے جھنجوڑتے تنبیہی انداز میں کہا۔ رانیہ جیسے ہوش میں لوٹی تھی۔ وہ آنکھیں پھاڑے تبریز کو دیکھ رہی تھی جو چہرے پہ شدید غصہ اور ناپسندیدہ تاثر لئے اسے گھور رہا تھا۔ رانیہ کے بازوؤں پہ اب بھی تبریز کی مضبوط گرفت تھی۔ اچانک اس نے اپنے بازوؤں پہ نگاہ ڈالی۔ تبریز نے آہستہ سے اپنے ہاتھ پیچھے ہٹا لئے۔ رانیہ تیزی سے واپس پلٹی اور زور سے دروازہ بند کرتی اپنے کمرے مین چلی گئی۔

تبریز نے فرش پہ پڑی صلہ کو دیکھا جو اب ارد گرد سے بے خبر بے ہوش تھی۔

☆☆☆

تکلیف کا شدید احساس تھا جو اس کے پورے وجو پہ حاوی تھا پر سب سے زیادہ درد اس وقت اسے اپنے سر اور دائیں ہاتھ کی انگلیوں میں محسوس ہو رہا تھا۔ اسے خیال آیا رانیہ نے اس کا سر کئی بار سنگِ مرمر کے پختہ فرش پہ پٹخا تھا۔ اس کا ماتھا پھٹ گیا تھا جہاں سے اس وقت خون بھی بہنے لگا تھا پر وہ اس قابل نا تھی کہ مزاحمت کر پاتی۔ پھر شائد تبریز آیا تھا وہاں۔۔۔ اس نے رانیہ کو روکا تھا لیکن صلہ کی حسیات جواب دینے لگی تھیں۔ ان دونوں کے درمیان کیا بات ہوئی وہ سن نہیں سکی تھی اور آہستہ آہستہ اس کا وجود ایک تاریک سرنگ میں اترنے لگا۔ اور اب جانے کتنی دیر کی بے ہوشی کے بعد اسے اپنے زخموں کی خبر ان سے اٹھتی ٹیسوں کے باعث محسوس ہونے لگی تھی۔ اس نے سوچا شائد وہ اب تک اسی سرد فرش پہ لیٹی ہے لیکن نہیں۔۔۔۔۔۔ یہ فرش تو نہیں لگ رہا تھا۔ اس نے آنکھیں موندے موندے محسوس کیا تھا۔ یہ جگہ نرم تھی اور گرم بھی۔۔۔۔۔ ماں کی گود کی طرح یا پھر اس کے

پرانے کمرے میں پڑے ملائم بستر جیسی۔۔۔۔۔پر یہ دونوں جگہیں تو اب اس کی قسمت سے جا چکی تھیں۔تو پھر؟؟؟؟اس کا ذہن سوچ نہیں پا رہا تھا۔اسے تھکن ہو رہی تھی۔آہستہ آہستہ اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔اس کے ارد گرد مدہم سی روشنی تھی۔اتنی کہ وہ اپنے ارد گرد ہر شے کو بآسانی دیکھ سکتی تھی پر اس نے کچھ بھی نہیں دیکھا تھا۔وہ بس آنکھیں کھولے چت لیٹی چھت کو گھور رہی تھی۔چھت پہ بنے دلکش نقش و نگار اس مدہم روشنی میں بے حد نمایاں ہو رہے تھے۔یہ کون سی جگہ ہو سکتی ہے؟اس نے سوچنا چاہا تھا۔۔۔۔۔اس کے کمرے کی بناء قلعی سیاہ پلستر والی بھدی چھت اسے زبانی یاد تھی تو پھر۔اچانک اسے اس اجنبی جگہ پہ اپنی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"لیٹی رہو"۔تبریز نے دھیمے اور سنجیدہ لہجے میں کہا تھا۔صلہ نے چونک کر دیکھا۔وہ دائیں طرف رکھے صوفہ پہ ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھا اسی کی طرف متوجہ تھا۔اس نے آنکھیں پھاڑے اپنے ارد گرد کا جائزہ لیا۔یہ تبریز کا کمرہ تھا۔اسی کا بستر تھا۔وہ سالوں سے اس کمرے کی صفائی کرنے بارہا یہاں آ چکی تھی پر اس وقت تبریز یہاں موجود نہیں تھا لیکن آج پہلی بار۔۔۔۔۔اس نے ایک بار پھر بے یقینی سے تبریز کو دیکھا۔وہ اب صوفے سے اٹھ کر اس کے پاس آ چکا تھا اور بے حد غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔اچانک صلہ کو احساس ہوا اس کی چادر اس کے پاس نہیں ہے۔

"میں یہاں کیسے ؟" نگاہیں جھکائے اس نے اپنے ارد گرد چادر تلاش کی۔ وہ اس کے پیروں کی طرف پڑی اس کی دسترس سے کچھ فاصلے پر تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا وہ کیسے ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھائے۔ تبریز نے اس کی مشکل آسان کر دی تھی۔

"تمہارے سر پہ زخم گہرا ہے۔ ڈاکٹر نے احتیاط کرنے کو کہا ہے"۔ اس کے ہاتھ میں چادر تھماتے تبریز اب اس کے پاس ہی بیڈ کے کونے پہ بیٹھ گیا تھا۔ صلہ نے جلدی سے چادر لپیٹ لی۔ اس مار پیٹ کے باعث اس کے بال بھی منتشر تھے۔ تبریز نے دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں سے ماتھے کا جائزہ لیتے سنجیدگی سے کہا۔ صلہ کو حیرت ہوئی تھی۔ تو کیا اس کی خاطر ڈاکٹر بلایا گیا تھا؟

"اتنا بھی گہرا نہیں۔ ایسی چوٹیں تو لگتی ہی رہتی ہیں"۔ اس نے چہرہ دوسری طرف کیا تو تبریز نے اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا۔

"تو کیا اس سے پہلے بھی تمہیں۔۔۔" وہ جیسے شاک میں تھا۔

"انہیں ڈپریشن کے یہ دورے آئے دن پڑتے ہی رہتے ہیں ایسے میں ان کے ہاتھ جو آتا ہے وہ اسے میری طرف اچھال دیتی ہیں"۔ صلہ بے بسی سے مسکرائی۔ وہ اس معمول کی عادی ہو چکی تھی اور اب تو یہ سب اسے تکلیف نہیں دیتا تھا۔ قدسیہ کبھی اس کے زخم پہ ہلدی لگا دیتی تو کبھی یونہی چند روز تڑپ کر چوٹیں مندمل ہو جاتیں۔ نا کوئی ڈاکٹر بلاتا تھا نا دوا لگتی تھی۔ ایک وہ وقت تھا جب اس کی معمولی سے معمولی بیماری اس کے ماں باپ کو رات رات

بھر جگائے رکھتی تھی۔اس کے ایک وقت بھوکا رہنے پہ اس کی ماں کی راتوں کی نیند حرام ہو جاتی تھی۔اور پھر اسی ماں نے اسے اس دوزخ میں دھکیل دیا جہاں وہ اسے شدید سے شدید تکلیف میں بھی کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔

"بھابھی کی طرف سے مین معذرت چاہتا ہوں۔ان کے حالات۔۔۔۔۔"تبریز لب بھینچے بے انتہا شرمندگی سے بولا۔صلہ نے عجیب نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا کہ وہ کہتے کہتے رک گیا۔

"جانتی ہوں۔بارہا سن چکی ہوں۔اپنے شوہر کے قاتل کی بہن سے اس سے بڑھ کر کوئی اور سلوک ہو بھی کیا سکتا ہے"۔اس کا انداز عام سا تھا پر تبریز کے چہرے پہ شرمندگی کا عکس ابھرا تھا۔صلہ نے مزید کچھ کہنے کی بجائے اپنا لباس درست کیا اور کمبل کھینچ کر سائیڈ پہ کرتے بیڈ کی دوسری طرف سے اترنے لگی۔

"تم یہیں رکو"۔تبریز نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"یہ میرا مقام نہیں۔"اس نے پلٹ کر تبریز کے ہاتھ میں پکڑی کلائی کو دیکھا اور پھر دوسرے ہاتھ سے اسے پیچھے کرتی اس بار کچھ تیزی سے بیڈ سے اتر کر کھڑی ہو گئی۔

"ایک بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی۔جب میں کہہ رہا ہوں تمہیں اس کمرے میں رکنا ہے تو سنتی کیوں نہیں"۔تبریز بجلی کی سی تیزی سے اٹھ کر اس کی طرف بڑھا۔اس کا انداز حکمیہ اور آواز بلند تھی۔پہلی بار صلہ نے اسے اتنے سخت لہجے میں بولتے دیکھا تھا کہ گزرے چند دنوں میں وہ اسے بہت کم گو اور دھیمے مزاج کا انسان معلوم ہوا تھا۔

"کیوں رکوں میں یہاں اور کس حیثیت سے۔ اس گھر کا ہر شخص مجھے دن رات میری اوقات بتاتا ہے۔ ونی ہوں میں اور ونی کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی"۔ صلہ کو جانے کیا ہوا تھا کہ بجائے اس کے غصے سے خوف کھانے کے وہ ایکدم پھٹ پڑی تھی۔ اسی کی طرح بلند اور دوٹوک انداز میں کہتی وہ اب اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

"تو اس سب میں میرا کیا قصور ہے بولو۔ یہ غصہ جو مجھے دکھا رہی ہو اپنے ماں باپ کو کیوں نہیں دکھایا جنہوں نے تمہیں یہاں پھینک دیا۔ اس بھائی کو کیوں نہیں دکھایا یہ غصہ جس نے اپنی جان بچانے کی خاطر بہن کی زندگی برباد کر دی۔ تمہارے لئے قتل کر سکتا تو کیا سولی نہیں چڑھ سکتا۔ بس ہتھیار چلانے تک تھی اس کی غیرت؟" جواب ترکی باتر کی آیا تھا۔ دونوں بازوؤں سے جھنجوڑتے اس نے ایک بار پھر اسی تلخ اور بلند آواز میں کہا تھا۔ صلہ کے اندر پلتا شکوہ جو ابھی چند لمحوں پہلے تبریز کے آگے لاوا بن کر ابلا تھا ایکدم سرد پڑ گیا۔ وہ کیا غلط کہہ رہا تھا؟ قصور تو اس کے اپنوں کا تھا پھر وہ کس طرح تبریز سے شکایت کر سکتی تھی۔ کس حق سے وہ تبریز سے نفرت کر رہی تھی کہ یہ سب اس کی وجہ سے نہیں وہ اپنے ماں جائے کی بدولت بھگت رہی تھی جس نے غیرت میں آکر گولی تو چلا دی پر اس کی سزا کا پھندا بہن کے گلے میں ڈال دیا تھا۔ سچ ہی تو کہہ رہا تھا تبریز۔ اچانک اس کا وجود ڈھیلا پڑنے لگا۔ سبکی و اہانت کا احساس چند پل پہلے وجود میں اٹھتے مان پہ حاوی ہو چکا تھا۔ صلہ نے بے اختیار گردن جھکا دی۔

"مجھے باتیں دہرانے کی عادت نہیں۔ آج سے تم یہیں رہو گی۔ اس سرونٹ کوارٹر میں نہیں۔ اب جاؤ جا کر آرام کرو"۔ تبریز کی گرفت اب بھی اس کے بازوؤں پہ اتنی ہی مضبوط تھی کہ اس میں استحقاق شامل تھا۔ اور پھر اس نے انگلی کے اشارے سے دوٹوک انداز میں تنبیہہ کرتے صلہ کو اپنے کمرے میں ٹھہرنے کا حکم دیا تھا۔ صلہ بس

دیکھتی رہ گئی۔ تبریز متانت سے چلتا کمرے سے باہر نکل گیا اور جاتے ہوئے کمرے کا دروازہ بند کر گیا تھا۔ صلہ نے بے بسی سے کمرے کے بند دروازے کو دیکھا اور پھر گرنے کے سے انداز میں واپس بیڈ پہ بیٹھ گئی۔

پتا نہیں اس کی قسمت میں مزید کون سی آزمائش لکھی تھی۔

☆☆☆

صلہ اس وقت کہاں تھی یہ بات گھر میں صرف قدسیہ جانتی تھی۔ اسے بیہوشی کی حالت میں اٹھائے تبریز اس وقت اپنے کمرے میں لے آیا تھا اور پھر اس نے قدسیہ کو بلایا تھا ساتھ ہی فلک شیر کو ڈاکٹر لانے کا حکم دیا تھا۔ گھر میں ڈاکٹر آنے کی بابت سردار صاحب اور رانیہ کو کچھ نہیں بتایا گیا تھا۔ البتہ صلہ کے متعلق بھی وہ اب تک بے خبر تھے ۔ جس طرح رانیہ نے اسے مارا تھا ظاہر سی بات ہے وہ اب چند دن کام کاج کے قابل نہیں تھی تو یقیناً اپنے کوارٹر میں ہوتی۔ ان دونوں کو ہی اس میں دلچسپی نا تھی کہ وہ زندہ ہے یا مر گئی۔ رانیہ خود کون سی درست ذہنی حالت میں تھی۔ وہ زیادہ تر وقت اپنے کمرے میں ہی گزارتی تھی۔ تبریز کو قدسیہ نے تسلی دی تھی کہ وہ خود صلہ کی خوشیوں کی اٹھتے بیٹھتے دعائیں کرتی تھی۔ صلہ پوری رات تبریز کے کمرے میں رہی جبکہ وہ خود صوفے پہ بیٹھا اس کے متعلق سوچتا رہا۔ اس کے اندر احساسِ گناہ اور بڑھا تھا کہ کچھ بھی تھا وہ اس کی بیوی تھی جو اس وقت زخمی حالت میں پڑی تھی تو اس کی وجہ فقط تبریز کی عدم توجہی تھی۔ وہ اگر اس کی طرف سے بے خبر نا ہوتا تو آج شائد اس کے ساتھ اتنی زیادتی نا ہو رہی ہوتی۔

صلہ کو تنبیہ کر کے وہ کمرے سے نکل آیا تھا مگر دروازہ احتیاطاً باہر سے لاک کر دیا تھا۔ شروع میں بے ضرر اور خاموش دکھائی دینے والی صلہ کا اس کے ساتھ رویہ کچھ اور ہی تھا جو اسے خاصا حیران کر رہا تھا۔ وہ تو سمجھا تھا وہ ہر گز مزاحمت نا کرے گی پر وہ نا صرف شکوہ کر رہی تھی بلکہ اس کی بات ماننے سے بھی انکاری تھی۔ تبریز کو اپنے سخت رویے پہ افسوس تھا پر اس وقت اسے روکنے کا اس کے سوا دوسرا کوئی طریقہ نا تھا۔ قدسیہ کو صلہ کے کھانے پینے کی طرف ہدایت کرتا وہ گھر سے نکل گیا تھا۔

☆☆☆

تبریز کی واپسی کچھ دیر بعد ہوئی تھی۔ وہ کمرے کا دروازہ بند کر کے اندر داخل ہوا تو صلہ ایک بار پھر سوئی پڑی تھی لیکن اس کے اندر آتے ہی وہ چادر درست کرتی اٹھ بیٹھی۔ شائد دروازے کی آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ تکیے سے ٹیک لگائے وہ سر جھکائے بیٹھی اپنی انگلیوں کو دیکھ رہی تھی۔ دائیں ہاتھ میں اب پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس نے ایک بار بھی نگاہ اٹھا کر تبریز کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

"یہ کپڑے میں تمہارے لئے لایا تھا"۔ تبریز نے ہاتھ میں پکڑے لفافے کو اس کے پاس بیڈ پہ رکھتے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ وہ پہلے والی خفگی اور غصہ اب نہیں تھا۔

"مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔ ویسے بھی مجھے یہاں رنگ پہننے کی اجازت نہیں"۔ صلہ نے اس کی طرف دیکھے بغیر دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ وہ لفافے سے جھانکتے کپڑوں کے دلکش رنگ دیکھ چکی تھی۔

"کس نے لگائی ہے یہ پابندی تم پہ؟"تبریز کے سوال پر اس نے نگاہ اٹھائی۔

"رانیہ بھابھی نے۔" رانیہ نے ہی اسے پہلی بار وہ کالا لباس دیا تھا۔وہ اس وقت بہت چھوٹی تھی۔اسے بالکل سمجھ نہیں آئی تھی یہ رنگوں سے دور رہنے کا حکم کیوں دیا جارہا ہے لیکن پھر وقت کے ساتھ اسے اندازہ ہوا تھا رانیہ اس کی زندگی سے رنگ نہیں خوشیاں نکال چکی ہے۔وہ اسے احساس دلانا چاہتی تھی کہ اب اس کی زندگی بھی اس سیاہ رنگ کی طرح ماتم کرتے گزرے گی۔

"پر میری طرف سے تم پہ ایسی کوئی پابندی نہیں ہے۔تم جو رنگ چاہو پہن سکتی ہو اب تمہیں رانیہ بھابھی سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہین ہے"۔اس کے پاس بیڈ کے کونے پہ بیٹھتے اس نے عام سے انداز میں کہا۔صلہ اس بدلے ہوئے تبریز کو سمجھنے سے قاصر تھی۔یہ اگر ایسا تھا تو اب تک کہاں تھا۔اچانک اسے صلہ سے یہ ہمدردی کیوں ہونے لگ تھی۔سالوں بعد اسے صلہ کا خیال کس لئے آیا تھا۔

"تو پھر میں انہی کپڑوں میں ٹھیک ہوں کیونکہ اب مجھے اسی سیاہ رنگ کی عادت ہو چکی ہے۔رنگ دیکھ کر آنکھیں چندھیانے لگتی ہیں"۔وہ سر جھکائے اپنے ناخن کھرچ رہی تھی۔تبریز اس سے کچھ فاصلے پہ بیٹھا سنجیدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور وہ اس کی نگاہیں خود پہ محسوس کرتی عجیب خفت محسوس کر رہی تھی۔

"مجھے اندازہ نہیں تھا تم اتنی ضدی لڑکی ہو"۔صلہ کو اس کا طنز اچھا نہیں لگا تھا۔بھلا وہ کہاں ضد کرنے کی سکت رکھتی تھی۔اسے تو ٹھوکروں کی عادت تھی۔تبریز بیڈ سائیڈ ٹیبل ٹٹول رہا تھا۔ایک اسٹرپ مین سے دو گولیاں

نکال کر اس نے جگ سے گلاس میں پانی انڈیلا اور پھر دونوں چیزیں صلہ کی طرف بڑھا دیں۔ صلہ نے ہاتھ بڑھا کر چپ چاپ دوا اور گلاس پکڑا اور ٹیبلٹس نگل لیں بعد میں خود ہی گلاس سائیڈ ٹیبل پہ رکھ دیا۔ تبریز اب وہاں سے ایک ٹیوب اٹھائے اس پہ لکھی ہدایات پڑھ رہا تھا۔ ٹیوب کھول کر اس نے انگلی کی پور پہ دوا نکالی اور صلہ کے ماتھے پہ لگے زخم پہ ملنے لگا۔

"میں خود لگالوں گی"۔ وہ تلملا کر پیچھے ہٹی پر پیچھے بیڈ کراؤن تھا۔ تبریز سے دور جانا ممکن نا تھا۔

"ہاں! تم تو لگا ہی لو گی"۔ صلہ کی مزاحمت کی پرواہ کئے بغیر وہ دوا لگاتا رہا اور پھر سر جھٹک کر ہاتھ دھونے باتھ روم میں چلا گیا۔

☆☆☆

اس کا ذہن بے شمار سوچوں کی گرفت میں نہایت الجھا ہوا تھا۔ کل رات بھی اسی صوفے پہ سوتی جاگتی کیفیت میں گزری تھی اور اب بھی نیند چاہ کر بھی اس کی آنکھوں سے دور تھی البتہ سر شدید درد کر رہا تھا۔ سامنے اس کے بستر پہ صلہ لیٹی تھی۔ شائد وہ بھی جاگ رہی تھی۔ وہ اسے کمرے میں لے تو آیا تھا لیکن اب تک اس کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کر پایا تھا۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک اور غیر دانستہ تھا کہ اسے کچھ بھی سوچنے سمجھنے کا موقع نہیں ملا تھا اس پہ فلک شیر سے ہوئی گفتگو اسے مزید ذہنی کشمکش میں مبتلا کر رہی تھی۔

فلک شیر نے کہا تھا محبت ظاہر سے نہیں باطن سے کی جاتی ہے۔ دل کی باتیں "میں" سے نہیں "ہم" سے شروع ہوتی ہیں۔ خود سے بڑھ کر کسی دوسرے کی چاہ، اس کا خیال رکھنا محبت ہے۔ اس کی تکلیف پہ چوٹ اپنی روح پہ محسوس کرنا محبت ہے اور ان دیکھے کی محبت تو عبادت ہے۔ تبریز سوچ رہا تھا آخر فلک شیر جیسا سادہ اور عام سا شخص محبت جیسے نازک جذبے کی اتنی حسین تفسیر کیوں کر پیش کر سکتا ہے۔ اس کے پوچھنے پر کہ کیا وہ کبھی اس کیفیت سے گزرا ہے فلک شیر ہنس پڑا تھا پر اس کی ہنسی آنکھوں تک نہیں پہنچی تھی۔ تبریز کو لگا جیسے کچھ ایسا تھا جو وہ تبریز سے چھپا گیا ہے۔ وہ خود اس وقت بے تحاشہ ڈسٹرب تھا۔ کسی سے دل کا حال کہہ کر خود کو ہلکا کرنا چاہتا تھا۔ سردار صاحب کی نئی بات نے تو اس کے پیروں کے نیچے سے زمین ہی کھینچ لی تھی۔ جائیداد بچانے کی خاطر وہ اسے رانیہ سے شادی کا کہہ رہے تھے پر یہ تو طے تھا تبریز ان کا حکم کسی صورت ماننے کو تیار نہیں تھا۔ پھر انہیں اس من مانی سے روکنے کی خاطر اسے کوئی انتہائی قدم ہی کیوں نا اٹھانا پڑے کہ وہ رانیہ کو دل سے بہن مانتا تھا لیکن بات تو یہ تھی وہ فقط اپنا دامن بچانے کی سوچ رہا تھا۔ اس سب سے رانیہ کا کیا بھلا ہو پاتا۔ سوچ سوچ کر وہ پاگل ہو رہا تھا اور شائد اسی لے وہ فلک شیر سے اس بات کا تذکرہ کر بیٹھا۔ صلہ کے لئے شاپنگ کرنے وہ فلک شیر کے ساتھ ہی گیا تھا جب راستے میں اس نے اپنا مسئلہ فلک شیر کو سنایا۔ فلک شیر ان کا بہت پرانا ملازم تھا گو وہ ملازم نہیں تھا پر حالات نے اسے سردار صاحب کے در پہ لا پٹخا تھا۔ تبریز جانتا تھا وہ پڑھا لکھا ہے اور اچھے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے خاندانی ہونے اور شرافت کا تو یہ عالم تھا کہ کبھی اس نے اتنے سالوں میں ان کے گھر کے اندر جھانکا تک نہیں تھا۔

تبریز نے جب فلک شیر کو سردار صاحب کے فیصلے کے متعلق سنایا تو ایک شدید کرب تھا جو اسے فلک شیر کے چہرے اور آنکھوں میں نظر آیا تھا۔ پتا نہیں کیوں وہ اس سے محبت کے متعلق پوچھ بیٹھا تھا جس کے جواب میں فلک شیر نے جو کچھ کہا وہ لفظ بالفظ تبریز کے دل پہ لگا تھا۔ جانے اسے کیوں یہ احساس ہوا تھا کہ فلک شیر کی باتیں بے سبب نہیں ہیں اور کیوں اس کا ذہن انہیں رانیہ کے حوالے سے سوچ رہا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا پر جتنا سوچتا تھا اتنا ہی الجھتا چلا جاتا تھا۔ سوچ سوچ کر ذہن شل ہو گیا اور وہ کسی نتیجے پر نا پہنچ سکا۔

اسے سگریٹ کی طلب ہو رہی تھی۔ سگریٹ کا پیکٹ اور لائیٹر اٹھا کر وہ کمرے سے باہر ٹیرس میں آیا تو ایکدم ٹھٹھک کر وہیں رک گیا۔ سامنے صلہ ریلنگ پہ ہاتھ ٹکائے کھڑی تھی۔ پتا نہیں کب وہ بستر سے اٹھ کر باہر چلی آئی۔ اچھی خاصی سردی تھی اور اس نے شال اوڑھی ہوئی تھی۔ کپڑے بھی وہ بدل چکی تھی۔ تبریز سگریٹ جلائے بناء آواز اس کی سمت بڑھا اور اس سے نسبتاً فاصلے پہ جا کر کھڑا ہو گیا۔ صلہ نے گردن گھما کر اسے دیکھا تھا۔ تبریز نے بھی اسی وقت اس کی طرف دیکھا تھا۔ وہ وہاں کھڑی رو رہی تھی۔ صلہ نے جلدی سے ہاتھ کی پشت سے اپنے آنسو پونچھے اور کمرے کی طرف جانے لگی کہ تبریز نے اس کا ہاتھ تھام کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ بے اختیار اس کے سینے سے ٹکرائی تھی۔

"رونے کی وجہ؟" اس کی پلکوں پہ ٹکا آنسو کا قطرہ انگلی کی پور سے صاف کرتے اس نے سوال کیا تھا۔ اس کا بازو اب بھی صلہ کی کمر پہ تھا اور اس کی تھوڑی تبریز کے سینے پہ ٹکی تھی۔ صلہ نے پیچھے ہٹنے کی کوشش کی پر تبریز کی گرفت مضبوط تھی۔

"کوئی ایک وجہ تھوڑی ہے"۔وہ مسلسل مزاحمت کر رہی تھی پر ناکام رہی۔

"ایک وجہ تو میں ہوں اور اس کے علاوہ؟؟؟" وہ مسکراتے ہوئے دوستانہ انداز میں بولا پر صلہ کا دل جل کر خاک سیاہ ہو گیا تھا۔

"خود کو شہزادہ چارلس سمجھتے ہیں جو میں ان کی خاطر آنسو بہاؤں۔ہونہہ"۔لب کاٹتے اس نے فقط جل کر سوچا تھا۔ تبریز نے انگوٹھے کی مدد سے اس کے ہونٹ کو دانتوں کے ستم سے آزاد کرایا۔

"بڑی بری عادت ہے تمہاری جب جواب نہیں دے پاتی تو اپنے ہونٹوں پہ ستم ڈھانے لگتی ہو۔ویسے میں جانتا ہوں میں تمہارے لئے اتنا اہم نہیں جس کی خاطر تم آنسو بہاؤ لیکن تمہارے ساتھ ہوئی زیادتی میں سب سے زیادہ قصور میرا ہی ہے"۔صلہ نے گھبرا کر نظریں جھکا لیں۔یہ انسان کیسے اس کی سوچ پڑھ رہا تھا جبکہ اس سے تو احساس کا رشتہ بھی نہیں جڑا تھا اور یہ اس نے مجھے اتنے غور سے کب دیکھا جو اسے میری اس عادت کا علم ہو گیا۔اس کا دل اب زور زور سے دھڑک رہا تھا۔اتنی قربت کا تو تصور بھی نہیں کیا تھا۔کاش وہ کمرے سے باہر آئی ہی نا ہوتی۔

"مجھے سردی لگ رہی ہے"۔اس کی التجا پہ معنی خیز انداز میں مسکراتے تبریز نے اسے اپنی گرفت سے آزاد کر دیا تھا۔وہ الٹے پیروں تقریباً بھاگتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی تھی اور پھر چند پل اپنی پھولی ہوئی سانسوں اور بے ترتیب دھڑکنوں کو پر سکون کر کے پیچھے دیکھا۔تبریز اندر نہیں آیا تھا۔صلہ نے جلدی سے بیڈ پہ چھلانگ لگائی اور کمبل کو زرہ بکتر کی طرح اوڑھ کر لیٹ گئی پر اس کا دھیان اب بھی تبریز کی طرف ہی تھا۔بہت دیر بعد اس کے

قدموں کی چاپ کمرے کے اندر سنائی دی تھی۔صلہ کی ساری حسیات کان بنی تبریز کے قدموں کو محسوس کر رہی تھیں۔پھر کمرے کے سناٹے میں صوفہ پہ اس کے لیٹنے کی آواز آئی۔صلہ کو حوصلہ ہوا تھا پر نیند اب بھی اس کی آنکھوں سے غائب تھی۔پہلی بار اسے تبریز سے شدید خوف آرہا تھا۔

☆☆☆

گھر کے داخلی دروازے سے فلک شیر اندر داخل ہوا۔اسے دیکھ کر تہمینہ کے چہرے پہ بڑی پیاری سی مسکراہٹ ابھری جس میں ایک ماں کی محبت اور بہنوں سی شفقت شامل تھی۔اس نے بھی مسکرا کر سلام کرتے خیریت دریافت کی اور اس کے پاس ہی چوکی پہ بیٹھ گیا۔

"بڑے اچھے وقت پہ آئے ہو شیرو، کھانا بس تیار ہی ہے"۔ہاتھ میں پکڑی روٹی توے پہ ڈالتے اس نے کہا۔فلک شیر سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔تہمینہ اب چمٹے سے روٹی پلٹ رہی تھی۔فلک شیر انگلی سے گولے کے فرش پہ نا دکھائی دینے والی لکیریں بنانے لگا پر اس وقت اس کے ذہن میں اچھی خاصی کھلبلی مچی تھی۔پتا نہیں اسے یہ سب تہمینہ سے کہنا چاہیئے یا نہیں۔جانے وہ اس کے دل کا حال جاننے کے بعد اس کے متعلق کیا سوچے۔

"کیا سوچ رہے ہو شیرو؟" بہر حال اس کی یہ الجھن تہمینہ سے چھپ نہیں پائی تھی۔اس کی طویل ہو رہی خاموشی سے تہمینہ اتنا تو سمجھ ہی چکی تھی کہ وہ پریشان ہے۔

"سردار صاحب کے متعلق سوچ رہا تھا"۔ بالآخر اس نے کہنا شروع کیا۔ تہمینہ کے ماتھے پہ پڑے بل اس بات کا واضح ثبوت تھے کہ یہ نام اس کی سماعتوں پہ ناگوار گزرا تھا۔

"نام مت لو اس ظالم کا میرے سامنے"۔ سالن کی پتیلی میں چمچہ گھماتے اس نے غصے سے جواب دیا۔ فلک شیر اس کے چڑنے کی وجہ سے واقف تھا۔ ظاہر ہے سب کی طرح سردار صاحب کی باتیں اس سے بھی چھپی ہوئی نہیں تھیں۔ ورنہ اس کا سردار صاحب سے بھلا کیا واسطہ تھا۔

"آپ خوامخواہ جذباتی ہو رہی ہیں خالہ"۔ وہ مسکرایا۔ تہمینہ کا موڈ ہنوز خراب تھا۔ سالن پلیٹ مین ڈال کر اس نے گرما گرم روٹیاں فلک شیر کے سامنے رکھیں۔

"میں تو صرف جذباتی ہوں پر تم احمق بھی ہو شیرو۔ کتنی بار کہا تھا تم سے چھوڑ دو اس ذلیل انسان کی چاکری اور شہر چلے جاؤ۔ اب تو تم صاحبِ جائیداد ہو۔ دیکھو میرے بچے۔۔ برے کی صحبت میں رہنے سے انسان خود بھی برائی میں مبتلا ہو جاتا ہے"۔ اس کے بار بار کہنے کے باوجود فلک شیر آج تک سردار محسن علی کی ملازمت کر رہا تھا۔ اس کا دل دکھتا تھا یہ سب دیکھ کر کہ یہ اس کے معیار کا کام تو نہیں تھا۔ پر خود فلک شیر جیسے طے کر چکا تھا کہ اسے ہر حال میں یہیں رہنا ہے۔

"ان کی ملازمت میرے پاؤں کی زنجیر بنتی جا رہی ہے خالہ"۔ اس نے لقمہ بنا کر منہ ڈالا۔ جب بھی اسے ماں کے ہاتھ کا ذائقہ یاد آتا وہ تہمینہ کے پاس چلا آتا تھا۔ وہ اس سے عمر میں بہت زیادہ بڑی نہین تھی پر اس کی سگی خالہ

تھی۔ عمر کے اس کم فرق کی وجہ سے ان میں خالہ بھانجے سے زیادہ بہن بھائی والی قربت تھی۔ فلک شیر اس سے اپنی ہر بات کر لیتا تھا تو تہمینہ بھی اپنے مسئلے اسے سنا کر دل ہلکا کر لیتی تھی۔ ایک وہی تو بس اس کا میکہ تھا۔ فلک شیر کو اس کے پکائے کھانے میں اپنی ماں کے پکے کھانے کا ذائقہ محسوس ہوتا تھا۔

"تمہارے باپ نے تم پہ بڑا ظلم کیا۔ ظلم تو خیر اس نے میری بہن پہ ہی توڑا پر اپنی اولاد کے ساتھ زیادتی کرنے میں بھی کوئی کسر نہیں رہنے دی۔ مجھے آج بھی وہ وقت یاد ہے شیر وجب آپا نے گھر گھر ملازمت کر کے کس مشقت کے ساتھ تمہاری ذمہ داری اٹھائی۔ پر تمہارے باپ کو رحم نہیں آیا۔ اور اب جاتے جاتے اپنی جائیداد تمہارے حوالے کر کے سمجھ رہا ہو گا اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا۔ لیکن شیر و تم کب تک اپنے ناکردہ گناہوں کا کفارہ ادا کرتے رہو گے۔ یہ سب تمہارے شایانِ شان تو نہیں ہے نا"۔ اس کا ہاتھ تھامے وہ ایک بار پھر اسے سمجھانے لگی۔ وہ تاسف جو تہمینہ کو برسوں سے گھیرے تھا اور جس کا اظہار وہ ہمیشہ فلک شیر سے کیا کرتی تھی۔

فلک شیر کا باپ سکندر اس علاقے کا چھوٹا موٹا زمیندار تھا۔ اچھی خاصی زمین سونا اگلتی تھی۔ فلک شیر، تبریز ہی کے اسکول میں پڑھتا تھا۔ پھر ایک دن اس کی زندگی کا رخ اس حادثے نے بدل دیا۔ زندگی جو پر سکون اور بے فکری میں گزر رہی تھی یکدم کانٹوں سے بھر گئی۔ سکندر اور فہمیدہ کا رشتہ ٹوٹ گیا۔ دولت کے نشے میں چور سکندر نے بیوی کے ساتھ بیٹے کو قبول کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ فہمیدہ کا میکہ تو بس تہمینہ ہی تھی جس کی انہی دنوں نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ تہمینہ کے حالات خود بہت اچھے نہیں تھے پھر بھی اس نے ور اس کے نیک دل شوہر نے فہمیدہ اور فلک شیر کو پناہ دی۔ لیکن فہمیدہ اپنا اور اپنی اولاد کا بوجھ بہن اور بہنوئی پہ ڈالنے کے حق میں نا تھی۔ وہ خود ان

پڑھ تھی پر بیٹے کو پڑھانا چاہتی تھی۔ اس کی شدید محنت کا ثمر تھا کہ فلک شیر نے انٹر کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کی لیکن فہمیدہ اس وقت یہ خوشی دیکھنے کو زندہ نا رہی تھی۔ تبریز چونکہ اس کا اچھا دوست تاھ اور فلک شیر کے حالات سے بخوبی واقف تھا اسی لئے اس نے فلک شیر کو سردار صاحب کے پاس ملازم رکھوا دیا تھا۔ اس دوران وہ مزید پڑھتا بھی رہا تھا اور اتنے سالوں بعد سردار صاحب کا خاص الخاص بن چکا تھا جس پہ وہ آنکھ بند کر کے بھروسہ کرتے تھے۔

"سوچا تو میں نے بہت بار تھا پھر یہی خیال آیا زندگی تو جیسے تیسے گزر ہی رہی ہے۔ یہ دولت جائیداد تو سب آنی جانی چیزیں ہیں۔ خالہ اب میرا دل چاہتا ہے زندگی یونہی گزر جائے"۔ تین سال پہلے سکندر کو مرض الموت نے آگھیرا تو اسے بیٹے کی یاد ستائی۔ فلک شیر ماں پہ ہوا ظلم بھولا نہیں تھا پر باپ کی التجا بھی نظر انداز نا کر پایا اور ایک مرتے ہوئے شخص کی آخری خواہش پوری کرنے اس کے پاس چلا گیا۔ سکندر کے پاس وقت کم تھا اور ضمیر پہ بوجھ زیادہ۔۔۔ شائد اسی لئے دنیا سے جاتے وقت وہ فلک شیر کے نام اپنی ساری زمین جائیداد کر گیا لیکن اس نے سردار محسن علی کی ملازمت نہیں چھوڑی۔

یہ اس کا مقام نہیں تھا پھر بھی اس نے ہنس کر یہ نوکری کی اور ہمیشہ ان کی وفاداری نبھائی پر جب سے اس نے رانیہ کو دیکھا تھا اس کے دل کا سکون غارت ہو گیا تھا۔ اب اس کے اندر احساسِ ضرورت رہا تھا نا محسن علی کی وفاداری۔۔۔ اب تو بس وہ فقط وہاں اس لئے کام کرتا تھا کہ اس بہانے ہفتوں مہینوں بعد اسے رانیہ کی جھلک نظر آجاتی تھی۔

"کیسی باتیں کرتے ہو شیرو۔ بھلا یونہی بیگار کاٹنے کا مقصد۔ اپنی زمینیں سنبھالو، گرہستی بساؤ کیوں خود کو اتنا ارزاں ثابت کر رہے ہو"۔ تہمینہ پہ پہلی بار اس کی بدلی ہوئی سوچ آشکار ہو رہی تھی۔ اسے شدید حیرت نے آگھیرا تھا۔

"میں خود نہیں جانتا خالہ۔۔۔ پر اتنا جانتا ہوں جس کی بدولت یہ آرزو دل سے نکلی ہے وہ بھی مجھے کبھی نہیں ملے گی لیکن اس طرح کم سے کم وہ میری نگاہوں میں تو رہے گی"۔ آخر وہ اسے حالِ دل سنا بیٹھا تھا۔

"کس کی بات کر رہے ہو شیرو؟" وہ چونکی۔ تھوڑی پہ ہاتھ ٹکائے حیرت سے پوچھا تو فلک شیر نے نگاہیں جھکا دیں۔

"رانیہ کی"۔ وہ دھیمی آواز میں بولا پر تہمینہ کو کرنٹ لگا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی رانیہ سردار محسن علی کی بھتیجی اور اس کے مرحوم بیٹے کی بیوہ ہے۔ اس پہ عجیب انکشاف ہوا تھا۔

"تو کیا وہ بھی۔۔۔۔" وہ پوچھتے پوچھتے خاموش ہو گئی۔

"ہرگز نہیں خالہ۔ وہ تو اپنے ہی دکھوں میں گھری ایک معصوم روح ہے۔ یہ تو بس میرا دل ہے جو اس کے لئے بے اختیار ہے"۔ فلک شیر نے بے ساختہ اس کی بات کو رد کیا تھا۔ یہ تو بس وہی تھا جو رانیہ کی شادی سے بھی پہلے سے اس کی چاہت دل میں دبائے خاموش تھا۔ پھر جب رانیہ کی شادی شمشیر سے ہوئی تو اسے شدید دکھ ہوا تھا کیونکہ وہ شمشیر کی آوارگیوں سے واقف تھا۔ گو اس نے وہ سب کبھی نہیں چاہا تھا جو شمشیر کے ساتھ ہو گیا کہ اس نے ہمیشہ دل سے رانیہ کی خوشیوں کی دعا کی تھی کہ جس سے محبت کرتے ہیں اسے حاصل کرنے کی شرط نہیں رکھتے۔

"کیا بہت حسین ہے؟" وہ پوچھے بناء رہ نا سکی۔اس کے سوال میں چھپا تجسس محسوس کرتے فلک شیر ہولے سے مسکرایا تھا۔

یقیناً ہو گی۔۔۔۔جس کی غم سے مخمور آنکھیں اتنی دلکش ہوں وہ یقیناً کسی شاعر کی غزل سا حسن رکھتی ہو گی۔

"وہ تو اس کے احساس، اس کی خوشبو سے محبت کرتا تھا۔اس کی آواز کو چاہتا تھا۔اس نے تو کبھی وہ چہرہ دیکھا ہی نہیں تھا کہ نگاہ بھر کر دیکھنے سے کہیں وہ حسن پیکر میلا نا ہو جائے۔

"بناء دیکھے اتنی چاہت؟" تہمینہ مسکرائی۔کسی اور کے لئے یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ کسی کی صورت دیکھے بغیر بھی کوئی اتنی محبت کر سکتا ہے۔محبت بھی وہ جس میں مفاد کا شائبہ نہیں پر تہمینہ تو فلک شیر کو جانتی تھی۔اس کی فطرت سے آگاہ تھی، اس کی حساس طبیعت سے واقف تھی۔وہ کیسے نا مان لیتی کہ ہاں وہ ایسی محبت کر سکتا ہے لیکن پھر ساتھ ہی اسے سردار محسن علی کا خیال آیا تو اس کا چہرہ یکدم زرد پڑ گیا۔

"سردار کو پتا چلا تو جانے تمہارے ساتھ کیا سلوک کرے میرے بچے۔مجھے تو ابھی سے تمہاری فکر ہو رہی ہے"۔وہ اس انجام کا سوچ کر گھبرا گئی تھی جو یہ بات کھلنے کی صورت محسن علی، فلک شیر کے ساتھ کر سکتا تھا۔

"مجھے اپنی پرواہ نہیں پر میں اسے اس جہنم سے نکالنے کے لئے مر بھی سکتا ہوں"۔کسی غیر مرئی نقطے پہ سوچتے وہ سنجیدہ اور دوٹوک لہجے میں بولا تھا۔

☆☆☆

"وہ لڑکی مر گئی کیا"؟ تیسرے دن سردار صاحب نے قدسیہ سے پوچھ ہی لیا تھا۔ قدسیہ نے کھانا میز پہ لگاتے تبریز کی طرف دیکھا جو اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں خاموش رہنے کی تنبیہہ کر رہا تھا۔ وہ جو پاس بیٹھے ایک دوسرے کے اندر پل رہے درد سے نا آشنا تھا انہیں کیا خبر گھر میں اس وقت کون کہاں ہے۔ صلہ کا تبریز کے کمرے میں ہونا بھی کچھ اسی طرح اب تک چھپا ہوا تھا لیکن شائد اب یہ بات مزید مخفی نہیں رہ سکتی تھی۔ اس نے گہری سانس لیتے سوچا۔

"وہ بہت بیمار ہے سردار صاحب"۔ قدسیہ نے سر جھکائے دھیمی آواز میں کہا۔

"حرام خوری کی عادت پڑ گئی ہے۔ بہت ہو گیا آرام اب کام پہ واپس لگاؤ اسے"۔ قدسیہ خوفزدہ سی سر ہلاتی غائب ہو گئی پیچھے اب وہ، تبریز اور رانیہ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ صلہ کا کھانا قدسیہ تینوں وقت اوپر کمرے میں ہی پہنچا رہی تھی۔ وہ تینوں اب خاموشی سے کھانا کھا رہے تھے۔ پھر سب سے پہلے رانیہ اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف گئی۔ اس کے جاتے ہی سردار صاحب نے تبریز کو مخاطب کیا تھا۔

"تو پھر کب نکاح رکھا جائے۔ تم اپنی مرضی بتا دو"۔ وہ یوں بولے تھے جیسے باقی سب کچھ بھی اس کی زندگی میں اس کی مرضی کے مطابق ہی کیا گیا ہو۔ تبریز نے پانی کا گلاس ہاتھ سے رکھتے ان کی طرف دیکھا اور معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

"میری مرضی سے تو آج تک آپ نے کبھی کچھ ہونے ہی نہیں دیا بابا۔ خیر۔۔۔۔۔جب آپ چاہیں نکاح کا وقت طے کر لیں۔ مجھے تو کوئی مسئلہ نہیں۔" کندھے اچکاتے وہ استہزائیہ ہنسی ہنسا۔

"تو بس گھر کی بات ہے پرسوں شام کو ہی اس فرض سے سبکدوش ہو جاتے ہیں"۔ سردار صاحب نے اس کے انداز کو نظر انداز کرتے فقط جواب پہ دھیان دیا اور مطمعن سے انداز میں کہتے ڈائننگ ٹیبل سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ پیچھے تبریزلب بھینچے پر سوچ انداز میں بیٹھا ان کے فیصلے کے نتائج کے متعلق سوچتا رہا۔

☆☆☆

فارینہ ہتھیلیوں پہ مہندی رچائے اس کے سوکھنے کی منتظر تھی۔ ابھی اسے پارلر بھی جانا تھا گو کہ دل نہیں مان رہا تھا پر یہ ماں کی خواہش تھی اور ثمر کا بھی یہی کہنا تھا کہ اسے اپنی نئی زندگی کی شروعات اچھی امیدوں اور خوشگوار انداز میں کرنی چاہیئے۔ ثمر لاؤنج میں داخل ہوا تو ماں اور بہن کو دیکھ کر ہولے سے مسکرایا اور پھر ان کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ ذکیہ بیگم نے بیٹے کی اداس آنکھوں کو دیکھا اور پھر شکایت بھری نگاہ پاس بیٹھی بیٹی پہ ڈالی۔

"آخر کب تک یہ عشق کا جوگ لئے میری جان جلاتا رہے گا؟ اسے کہو فارینہ اب اس کا سوگ ختم کر دے۔ شادی کر لے۔ مجھ میں بیٹی کا غم دیکھنے کے بعد بیٹے کی اذیت سہنے کا حوصلہ نہیں بچا"۔ شائد وہ اس کے آنے سے پہلے اسی متعلق بات کر رہی تھیں۔ اب اسے دیکھ کر وہی شکوہ بے بسی سے دہرایا۔ جب فارینہ اور فیروز کا رشتہ ختم ہوا تھا ان کی زندگی سے خوشی اور سکون رخصت ہو گیا تھا رہی سہی کسر بھائی سے ہمیشہ کے لئے تعلق ٹوٹ کر پوری ہو گئی

تھی۔ لیکن چلو وہ تو اب اپنے گھر جا رہی تھی لیکن ثمر کی صورت جو مستقل سزا ان کا مقدر بن گئی تھی وہ انہیں عاجز کر رہی تھی۔

"میری شادی آپ کا نہیں میرا مسئلہ ہے امی پھر کیوں ہر بار اسے ہمارے درمیان لے آتی ہیں۔ آپ کے کہنے پہ فارینہ کی خاطر میں نے صلہ کو اس موت کے کنویں میں دھکیل دیا جہاں سے وہ کبھی باہر نہیں نکل سکتی تو پھر اب یہ زور زبردستی اور جذباتی بلیک میلنگ کس لئے؟" وہ غصے میں نہیں تھا، نا ہی ان سے بدتمیزی کر رہا تھا پر اس کا لہجہ مضبوط تھا جیسے وہ فیصلہ کر چکا ہے اور اب اسے کوئی بدل نہیں سکتا تھا۔

"اتنے سال بعد بھی تمہیں صلہ کی فکر ہے ثمر اپنی ماں کی نہیں؟" وہ شکایتی انداز میں بولیں پر فارینہ سے اب خاموش نہیں رہا گیا تھا۔

"بس کر دیں امی۔۔۔۔ آپ نے اپنی اولاد کو سمجھ کیا رکھا ہے؟ میری شادی کے وقت آپ کو بھائی عزیز تھا پھر فیروز کو بچانے کے لئے آپ نے بھی ماموں کی طرح بے حسی اوڑھ لی۔ دو گھر برباد ہو گئے۔ میرا اور فیروز کا رشتہ بچا، نا ہی میرا بھائی خوش رہ پایا اور آج بھی آپ کا رویہ وہی ہے"۔ جو کچھ اس کے ساتھ ہوا وہ فراموش کر بھی دیتی پر صلہ کے ساتھ ہوئی زیادتی کے بعد تو جیسے اسے فیروز سے نفرت ہی ہو گئی تھی۔ کیا قصور تھا اس معصوم کا جسے ایسے فرسودہ رواج کی بھینٹ چڑھا دیا گیا اور پھر پلٹ کر کبھی اس کی خبر تک نا لی۔ ایسے میں ثمر کی خالی زندگی اسے تڑپاتی۔ وہ جانتی تھی ثمر ایسا کبھی نہیں ہونے دیتا اگر فیروز اس کا شوہر نا ہوتا۔ ماں کے حکم نے اس کے ہاتھ باندھ دیئے تھے۔

"فارینہ تم چپ رہو۔امی کی طبیعت یوں بھی ٹھیک نہیں ہے۔ویسے بھی جو ہو چکا اسے دہرانے سے کیا حاصل ہو گا۔" ثمر نے اسے ٹوکتے ہوئے خاموش رہنے کو کہا۔وہ نہیں چاہتا تھا آج اس خوشی کے موقع پہ کسی کا بھی دل برا ہو۔

"امی پلیز۔۔۔یہ وقت میری شادی پہ ڈسکس کرنے کا نہیں ہے۔آپ فارینہ کے لئے دعا کریں بس۔الطاف بہت اچھا آدمی ہے اور میرے اچھے دوستوں میں سے ایک ہے۔"ان کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ کر انہیں تسلی دیتے اس نے انہیں دھیمے انداز میں سمجھایا۔

"لیکن ثمر مجھ سے وعدہ کرو۔۔۔فارینہ کے نکاح کے بعد تم بھی شادی کر لو گے بیٹا۔میں مرنے سے پہلے تمہارے سر پہ سہرا دیکھنا چاہتی ہوں"۔وہ التجائیہ بولیں تو ثمر کا انکار اس کے اندر ہی دم توڑ گیا۔ماں کی حسرت بھری التجا پہ وہ فقط سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا کہ وہ کبھی اس کے دل کی حالت نہیں سمجھ سکتی ہیں۔سر کے اشارے سے انہیں تسلی دیتے اس نے ماحول کی سنجیدگی کو کم کرنے کی خاطر ہلکے پھلکے انداز میں انہیں چھیڑا۔

"اب تو خیر سہرے پہننے کا رواج ہی نہیں رہا لیکن خیر۔۔۔اس بارے میں فارینہ کی شادی کے بعد بات ہو گی۔ابھی تو آپ یہ بتائیں ماموں کی طرف کب جانا ہے؟"اس کے جواب نے جہاں ذکیہ بیگم کو مطمعن کیا تھا وہیں اس آخری بات پہ وہ کچھ پریشان ہو گئی تھیں۔

"ان حالات میں؟؟؟" وہ تشویش سے بولیں۔ اب جب آج رات فارینہ کا نکاح تھا تو یہ خبر ان سب سے چھپی کہاں ہو گی۔ دلوں کی کڑواہٹ اور بھی بڑھ چکی ہو گی تو وہ کس طرح اس گھر میں پیر ڈالتیں۔

"روزینہ ممانی بہت زیادہ بیمار ہیں امی۔ ان کی عیادت کو نہ جانا زیادتی ہو گی۔" ثمر کے سمجھانے پہ سر ہلاتے انہوں نے فارینہ کی طرف دیکھا۔ اس نے ان کے کندھے کے گرد بازو ڈالتے سر اثبات میں ہلایا۔ بیٹی کی آنکھوں میں جھلکتا پیغام پڑھ کر ان کے دل کو اطمینان ہوا تھا۔ سچ ہے اللہ نے ان کی اولاد کو ان سے بڑھ کر ظرف دیا تھا جو اپنے درد کو بھول کر ان کی پریشانی پہ غمگین ہو رہے تھے۔

☆☆☆

"صرف ایک بار محسن علی۔۔۔۔ اس کی ماں مرنے سے پہلے ایک بار اسے دیکھنا چاہتی ہے۔" رفیق احمد بھکاریوں کی طرح ہاتھ پھیلائے ان کے ڈیرے پہ کھڑا تھا۔ بے حد مجبوری میں اس نے یہ قدم اٹھایا تھا کہ ڈاکٹروں نے روزینہ بیگم کی طرف سے جواب دے دیا تھا۔ صبح شام ان کے لبوں پہ ان دنوں بس ایک ہی فریاد تھی کہ وہ مرنے سے پہلے صلہ کو دیکھنا چاہتی ہیں۔

"شائد تم ہماری شرط بھول گئے رفیق احمد۔۔۔۔ ہم نے اسی وقت کہا تھا تمہارا اب اس سے کوئی تعلق نہیں ہو گا۔ پھر کیا سوچ کر ہمارے دروازے پہ چلے آئے"۔ رعونت سے کہتے سردار صاحب نے اپنا انکار ان کے منہ پہ مارا تھا۔

"مجھے سب یاد ہے، اپنا وعدہ بھی اور اپنی معصوم بیٹی کے ساتھ ہوا ظلم بھی پر کیا کروں اس مرتی ہوئی عورت کی التجا مجھے تمہارے در پہ بھکاری بنا لائی ہے۔ میرے کاسے میں ہماری بیٹی سے ایک ملاقات بھیک کی صورت ڈال دو سردار"۔ التجائیہ کہتے وہ آبدیدہ ہوئے کہ اسے کیا بتاتے انہیں تو اب ان کی برداشت سے بڑھ کر سزا مل چکی تھی۔ اس سے پہلے کہ محسن علی انہیں دھتکارتے یا ان پہ کوئی اور زہر بھرا جملہ پھینکتے تبریز بول پڑا تھا۔

"صلہ آپ کے ساتھ ضرور جائے گی"۔ رفیق احمد کے آنے کی اطلاع پا کر وہ فوراً ڈیرے پہ پہنچا تھا۔ ساتھ فلک شیر بھی تھا۔ باپ کا جواب تو وہ دروازے پہ کھڑا ہی سن چکا تھا۔ وہاں موجود کسی بھی شخص بشمول سردار محسن علی کے تاثرات کی پرواہ نا کرتے ہوئے اس نے آگے بڑھ کر رفیق احمد کے بندھے ہوئے ہاتھوں کو تھام لیا تھا۔

"تبریز۔۔۔۔" محسن علی لب بھینچے چلائے۔ تبریز نے پیچھے مڑ کر سنجیدہ نظروں سے ان کو دیکھا۔ وہ خاموش تھا پر انداز سردار صاحب کو بہت کچھ جتا گیا تھا۔

"آپ آئیں میرے ساتھ"۔ رفیق احمد کے کندھے پہ ہاتھ رکھے وہ انہیں اپنے ساتھ باہر لے آیا پیچھے سردار صاحب مٹھیاں بھینچے تڑپ کر رہ گئے۔ ڈیرے پہ موجود لوگ ایک دوسرے سے چہ مگوئیاں کر رہے تھے۔

☆☆☆

رفیق احمد کو نیچے بٹھا کر وہ اوپر کمرے میں چلا آیا۔ صلہ صوفہ پہ بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھی۔ تبریز کو دیکھ کر اس نے ایک پل کو سر اٹھایا اور پھر دوبارہ نگاہیں کتاب پہ جھکا لیں۔ ایک وقت تھا سارا دن کاموں سے فرصت سر نہیں

اٹھانے دیتی تھی اور اب یہ عالم کہ فرصت کے باعث دل بیزار رہتا تھا۔ تبریز نے تو اسے ایک کمرے میں قید کر رکھا تھا جہاں سے نکل کر وہ بس ٹیرس تک ہی جا سکتی تھی۔ وہ باہر جاتا تو کمرہ لاک کر جاتا۔ دن میں دو تین بار قدسیہ ہی اسے کھلانے پلانے چلی آتی۔ اسی سے صلہ نے اپنی کچھ کتابیں منگوالی تھیں۔ گزرے چار دن اس نے اس بند کمرے میں گزار تو لئے تھے لیکن اس کی سمجھ نہیں آتا تھا آخر مزید اسے یہاں کب تک ایسے ہی رہنا ہو گا۔ یہ خوف بھی تھا کہ رانیہ یا سردار صاحب کو معلوم ہو گیا تو وہ یقیناً اسے جان سے مار دیں گے۔

"نیچے تمہارے والد آئیں ہیں تمہیں اپنے ساتھ لے جانے۔" اس نے آتے ہی اسے مخاطب کیا تھا۔

"میرے ابا؟؟؟" صلہ نے بے یقینی سے سوال کیا۔ یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی تھی ورنہ وہ لوگ تو اب تک اسے بھول چکے تھے۔

"تمہاری امی کی طبیعت بہت خراب ہے وہ ان لمحوں میں تمہیں دیکھنا چاہتی ہیں"۔ تبریز نے بتایا۔ صلہ کو لگا ان لفظوں نے دل پہ کسی نے برچھی سا وار کیا ہے۔ وہ اپنی جگہ ساکت رہ گئی۔ تبریز خاموش سامنے کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔

"ان سے اب میرا کیا رشتہ؟" اچانک وہ جیسے ہوش میں آئی تھی۔ ایک گہری سانس لیتے اس نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

"خون کے رشتے یونہی ختم نہیں ہو جاتے صلہ۔ جاؤ ان کے ساتھ چلی جاؤ۔ وہ پہلے ہی تکلیف میں ہیں ان کی اذیت میں مزید اضافہ مت کرو"۔ اس کے پاس صوفے پہ بیٹھتے تبریز نے اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھتے کہا۔ صلہ بس دیکھتی رہ گئی پر اس بار اس کی مزاحمت دم توڑ گئی تھی۔ دل ماں کی محبت میں بے قرار ہو رہا تھا۔ بے اختیار چند آنسوؤں کی بوندیں چھلک کر تبریز کے ہاتھ کی پشت پہ آ ٹکیں۔

"چلو اب اٹھو"۔ اس نے ایک بار پھر کہا۔ صلہ نے کتاب سائیڈ پہ رکھ کر جلدی سے وہ گرم شال لپیٹی جو تبریز اس کے لئے لایا تھا اور اس کے کہنے پہ باہر چلی آئی۔ باہر کاریڈور میں تبریز کو دیکھ کر قدسیہ اس کی طرف لپکی یوں جیسے اسی کے پاس آ رہی ہو۔

"وہ سردار صاحب کہہ رہے ہیں قاضی صاحب کو بلاوہ بھیج دیا ہے۔ وہ وقت پہ پہنچ جائیں گے۔ آپ بھی تیار رہیئے گا"۔ صلہ کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ تبریز اس سے لاپرواہ قدسیہ کی طرف متوجہ تھا۔ یعنی چند روز پہلے لیے جانے والے فیصلے پہ عمل کا وقت آ چکا تھا۔

"میں کچھ دیر میں آتا ہوں۔ آپ بابا کو کہیں وہ بے فکر ہو جائیں"۔ تبریز نے سنجیدگی سے کہتے صلہ کو دیکھا جو زرد چہرے کے ساتھ کھڑی ان دونوں کو بے یقینی سے تک رہی تھی۔ ایکدم وہ تیز قدموں سے آگے بڑھ گئی۔ کچھ سوچ کر تبریز بھی اس کے پیچھے چل پڑا۔

قدسیہ آگے رانیہ کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

یہاں اس نے اپنی زندگی کے سولہ سال گزارے تھے۔ اس کی ہنسی اور قہقہے اس گھر کی فضاؤں میں گونجا کرتے تھے۔ بچپن کی ناسمجھی سے شعور کی دہلیز تک کا سفر اسی آشیانے میں کٹا تھا اور پھر ایک دن ڈولی کے نام پر اس کا جنازہ اٹھا۔ وہ وقت جب ماں نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر اسے اس نکاح کی بابت بتایا تھا اور پھر اس کے بھائی کی خاطر یہ موت کا پیالہ پینے کی التجا کی تھی۔ بیٹیاں تو باپ کی عزت کے لئے جان دے دیتی ہیں، بہنیں اپنے بھائیوں پہ قربان ہو جاتی ہیں پھر وہ تو بس اس کی شادی کر رہے ہیں۔ یہی کہا تھا اس دن صلہ سے روزینہ بیگم نے۔۔۔۔ اور وہ بس بے یقینی سے ماں کو دیکھتی رہ گئی۔ کیا سب حق بیٹوں سے ہی منسوب ہوتے ہیں۔ بیٹیوں کی خوشیاں، ان کی زندگی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اس کی نظروں کی تاب نالا کر وہ کمرے سے چلی گئی تھیں۔ پھر اسے تبریز کے ساتھ رخصت کرتے انہوں نے اسے گلے لگانا چاہا تو اس کا جسم کسی مردے کی مانند سرد اور بے حس تھا۔ وہ روئی تھی نا کوئی فریاد کی تھی۔ آج برسوں بعد اس نے دوبارہ اس گھر میں پیر ڈالا تھا پر نا وہ مانوس احساس تھا جو کبھی اس در و دیوار سے منسوب تھا اور نا ہی رشتوں کی مہک۔۔۔۔۔

سر جھکائے وہ باپ کے ہمراہ ماں کے کمرے میں چلی آئی تھی۔ اور چپ چاپ ان کے بستر کے سامنے رکھی کرسی پہ جا کر بیٹھ گئی تھی۔ انہوں نے اپنا ہاتھ بڑھا کر اسے پاس بلایا تو وہ اجنبیوں کی طرح ان کے پاس جا بیٹھی پر کہا کچھ نہیں۔ ذکیہ بیگم اسے سینے سے لگائے بہت دیر تک سسکیاں لیتی رہیں مگر صلہ ایک لفظ نا بولی۔ وہ اپنے حصے کے

آنسو بہا چکی تھی۔ نڈھال سی روزینہ بیگم نے سر پیچھے تکیے پہ ٹکا دیا۔ صلہ نے دیکھا وہ بے حد کمزور نظر آ رہی تھیں۔ وہ خود بھی تو کتنی بدل چکی تھی۔ روزینہ بیگم ایک ٹک اسے دیکھتی رہیں۔

وہ کس حال میں تھی وہ نہیں جانتی تھیں لیکن ان کا اپنا یہ حال تھا کہ اٹھتے بیٹھتے انہیں بیٹی کے ساتھ کیا ظلم چین نہیں لینے دیتا تھا۔ اس وقت صلہ کی آنکھوں سے جھانکتی حیرت اور بے یقینی آج بھی انہیں بھلائے نا بھولتی تھی پر وہ مجبور تھیں۔ اس کی خاموشی نے اس وقت انہیں تکلیف پہنچائی تھی مگر پھر بیٹے کو صحیح سلامت گھر واپس دیکھ کر جیسے صلہ سے ہوئی ہر زیادتی کا ازالہ ہوا تو ملال بھی دل سے رخصت ہوا۔ مگر یہ وقت بڑی ظالم شے سے۔۔۔۔ رفیق احمد نے یہ ساری تکلیف بیٹی کی جھولی میں فقط اس لئے ہی تو ڈالی تھی نا کہ اسے اپنا وارث سلامت چاہیئے تھا۔ آخر فیروز سے ہی تو اس کا خاندان اس کی نسل چلنی آگے بڑھنی تھی۔ پر قدرت اپنا آپ دکھا کر ہمیں احساس دلاتی ہے کہ وہ ہمارے ہر عمل، ہر فیصلے پہ حاوی ہے۔ فیروز سے فارینہ کی شادی کے دو ڈھائی سال تک روزینہ بیگم گھر میں بچے کی قلقاریاں سننے کو ترستے رہے۔ پوتا پوتی کی خوشی دیکھنے کی خواہش دن رات ان کے اندر کروٹیں بدلتی۔ دوسری طرف ذکیہ بیگم بھی بیٹی کی خالی گود بھرنے کی آس دل میں لئے اسے اب تک کئی ڈاکٹروں کو دکھا چکی تھیں۔ علاج کیا ہوتا کہ جب کوئی نقص ہی نہیں تھا۔ فارینہ کی زندگی سے روشنی وقت کے ساتھ ساتھ رخصت ہو رہی تھی۔ فیروز تو اسے ویسے بھی کبھی اچھا نہیں لگا تھا پھر بھی اس نے اپنے طور اس رشتے کو نبھانے کی پوری کوشش کی تھی۔ حالانکہ صلہ کی شادی پہ اسے ان سب سے شکایت تھی کہ اس کے ساتھ بڑا ظلم ہوا تھا پھر بھی ماں کے کہنے پہ وہ بھی بھائی کی طرح ہونٹوں پہ تالا لگائے رہی۔ خود روزینہ بیگم کی شکایت بھی ان کے رویے

سے جھلک رہی تھی۔ آخر کب تک وہ اس کے خالی دامن کے ساتھ زندہ رہتے۔ فارینہ کی زندگی کا خالی پن بھی حد سے بڑھ چکا تھا۔ ان حالات میں فیروز اور فارینہ کے درمیان بڑھتی خلیج نے ایک دن ان دونوں کے رشتے کو بھی مٹا ڈالا۔ دو سال پہلے فیروز نے فارینہ کو طلاق دے دی تھی۔ ذکیہ بیگم تو پہلے ہی فارینہ کے حالات سے ادھ موئی ہو رہی تھیں، اب اس کا گھر آ بیٹھنا انہیں جیتے جی مار گیا تھا۔

دوسری طرف روزینہ بیگم نے اس بار بہو میکے سے لانے کا فیصلہ کیا اور اپنی بہن کی بیٹی سے فیروز کی شادی کر دی۔ ڈیڑھ سال بعد بھی حنا کی جھولی اولاد کی خوشی کو ترستی رہی تو مجبوراً بہت زور زبردستی اور تقریباً ہر ڈاکٹر کے تقاضے کے بعد فیروز نے اپنا معائنہ کروانے کی حامی بھری۔ اس وقت آسمان ان سب کے سر پہ گرا تھا۔ وہ خود باپ بننے کی صلاحیت سے محروم تھا۔ دوسرے لفظوں میں رفیق احمد کا وارث اس کی نسل آگے نہیں بڑھا سکتا تھا۔ حنا اس خبر کے بعد میکے چلی گئی تھی اور پھر وہیں سے اس نے خلع کا کیس دائر کر دیا۔ گھر کی ویرانی روزینہ بیگم کو دن رات ادھ موا کر رہی تھی۔ رفیق احمد الگ ان سے نظریں نہیں ملا پاتے تھے اور فیروز تو جیسے دنیا کی ہر شے سے بے خبر ہو گیا تھا۔ تینوں کا احساسِ ندامت صلہ سے جڑا تھا۔

روزینہ بیگم اس کا ہاتھ تھامے آہستہ آہستہ اپنی آپ بیتی سنا رہی تھیں۔ وہ بے تاثر چہرے کے ساتھ ان کے سامنے خاموش بیٹھی تھی۔ وہ کیا ردِ عمل کرے اسے کچھ سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا۔ کیا اسے افسوس کا اظہار کرنا چاہیئے ۔۔۔ اس نے سوچا تھا۔ پر خود اس کی اپنی زندگی بھی تو اس سے بڑھ کر تکلیفوں سے آراستہ تھی۔

"تم خوش تو ہو نا صلہ؟" روزینہ بیگم کو اب اس کی خیریت دریافت کرنے کا خیال آ ہی گیا تھا۔۔۔خوشی؟؟؟صلہ اس لفظ کا مطلب تو بھول ہی گئی تھی۔وہ انہیں کیا بتاتی اس کی خوشیاں تو اس کے اپنوں نے چھین لی تھیں۔اب تو بس زندگی تھی جو سانسوں کی مجبوری کے تحت گزر رہی تھی۔ہاں چند روز پہلے اس کی زندگی میں ایک طوفان کی آمد ہوئی ہے۔سرونٹ کوارٹر سے تبریز کے کمرے کا سفر طوفان سے کم تو نہیں۔۔۔۔وہ اسے رحم سمجھے یا التفات۔۔۔کرم سمجھے یا قرب۔۔۔لیکن اس سے آگے یہ ریلا اب اسے کہاں بہا کر لے جانے والا ہے۔گھر سے نکلتے اس نے قدسیہ کی زبان سے جو باتیں سنیں اس کے بعد تو اب یقیناً اسے واپس اپنے کوارٹر میں ہی جانا ہو گا۔صلہ کا ذہن گھڑی کی سوئیوں میں الجھ گیا تھا۔روزینہ بیگم اب تک اس کے جواب کی منتظر تھیں۔

"صلہ"۔اس کی خاموشی سے گھبرا کر انہوں نے اس کے گال کو چھوا۔

"خوش ہوں"۔۔۔اس کے خیالوں کا تسلسل ٹوٹا تھا۔اس نے چونک کر ماں کو دیکھا اور پھر نظریں چرائے آہستہ سے کہا۔روزینہ بیگم کو اس کے جواب نے مطمعن کیا تھا یا نہیں اس نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔وہ ان کے پاس تقریباً چار گھنٹے رہی تھی۔پھر رفیق احمد ہی اسے واپس چھوڑ آئے تھے۔وہ گھر سے باہر نکل رہی تھی جب ثمر،ذکیہ بیگم کے ساتھ وہاں پہنچا۔ان دونوں کو اسے دیکھ کر حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔خود ذکیہ بیگم بھی حیران تھیں پر سب سے بڑھ کر تو حیرت رفیق احمد کو تھی جو بہن اور بھانجے کو دیکھ کر بے تحاشہ خوش ہو گئے تھے۔فیروز اور فارینہ کی طلاق کے بعد ان بہن بھائی کے درمیان بھی تعلقات ختم ہو گئے تھے۔الطاف،ثمر کے ساتھ ہی پولیس میں تھا اور اس کا اچھا دوست تھا۔ایک حادثے میں اس کی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا۔اس کا ایک بیٹا تھا جس کی

عمر ڈیڑھ سال تھی۔ وہ بچے کی خاطر شادی کرنا چاہتا تھا۔ ثمر کو لگا اگر فارینہ کو اعتراض نا ہو تو وہ الطاف سے اس سلسلے میں بات کر سکتا ہے۔ فارینہ جانتی تھی اس کی ماں کتنی پریشان ہے اس کی وجہ سے، یہی سوچ کر اس نے ایک بار پھر گھر بسانے کی حامی بھر لی تھی۔ بہر حال ثمر کے کہنے پر ذکیہ بیگم سب کچھ بھلا کر بھاوج کی خبر گیری کو پہنچ گئی تھیں۔ رفیق احمد انہیں لئے روزینہ بیگم کے کمرے کی طرف چل پڑے۔ پیچھے لاؤنج میں ثمر اور صلہ تنہا تھے۔ وہ تو رخ موڑے کھڑی باپ کی منتظر تھی اور ثمر ایک ٹک اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ برسوں سے وہ ایک انتظارِ لاحاصل میں زندگی گزار رہا تھا۔ اس کے احساس کے ساتھ زندہ تھا۔ اور آج وہ احساس خاموش تصویر کی صورت اس کے سامنے کھڑا تھا پر اس میں یہ حوصلہ نہیں تھا کہ اس کی خیریت ہی دریافت کر لیتا۔ وہ چادر کا پلو مروڑتی اس کی موجودگی سے پریشان تھی۔

"مجھے معاف کر دینا صلہ۔۔۔ میں مجبور تھا"۔ ثمر کی آواز پہ چونک کر صلہ نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ یہ وہی جذبہ تھا جو آج بھی اس کی آنکھوں میں سے جھانک رہا تھا جب آخری بار ثمر کی صلہ سے ملاقات ہوئی تھی۔ صلہ کے لئے وہ لمحے اب کہیں دور رہ گئے تھے۔ اس وقت وہ اگر اپنی کم سنی کے سبب ثمر کے احساسات کو سمجھ نہیں پائی تھی تو آج اس کا شعور اسے ان جذبوں سے نابلد رہنے کی تنبیہہ کر رہا تھا۔

"میں سب کو معاف کر چکی ہوں ثمر بھائی۔ اللہ نے میرے نصیب میں یہی لکھا تھا اور میں اسے نصیب کا لکھا سمجھ کر قبول کر چکی ہوں"۔ صلہ لب بھینچے سنجیدگی سے بولی اور پھر تیز تیز قدم اٹھاتی داخلی دروازے کی طرف چلی گئی۔ پیچھے ثمر چند پل اداس نظروں سے اسے دیکھتا رہا اور پھر روزینہ بیگم کے کمرے کی طرف قدم بڑھا دیئے۔

☆☆☆

فلک شیر کا نام تبریز کی زبان سے سن کر سردار صاحب کا خون کھول رہا تھا۔ ایک معمولی ملازم سے وہ رانیہ کا نکاح کر رہا تھا اور انہیں عین وقت پہ اس بات کی اطلاع دی جا رہی تھی وہ بھی قاضی اور گواہان کی موجودگی میں۔ اہانت کے شدید ترین احساس کے زیرِ اثر سردار صاحب ہال سے نکل کر پیر پٹختے اپنے کمرے میں چلے آئے تھے۔ پیچھے تبریز نے ان لوگوں کو نکاح کی رسم مکمل کرنے کا کہا اور خود باپ کے پیچھے چلا آیا۔ وہ اسے دیکھتے ہی اپنا ضبط کھو کر اسے برا بھلا کہنے لگے۔ انتہائی سنگین الفاظ میں انہوں نے اسے کچھ بہت برا ہو جانے کی دھمکی دی تھی۔ تبریز نے بڑے تحمل سے ان کی ہر بات سنی تھی اور پھر سنجیدہ مگر دھیمی آواز میں بولنا شروع کیا۔

"میں نے آپ کو اپنا فیصلہ اسی دن سنا دیا تھا بابا۔ رانیہ بھابھی سے شادی میں کبھی نہیں کر سکتا۔ باقی آپ کا مجھ سے شکوہ بجا ہے کہ میں نے آپ کو اس (فلک شیر) متعلق پہلے آگاہ نہیں کیا اور میں مجبور تھا کیونکہ اگر آپ جان لیتے تو یہ شادی نا ہونے دیتے۔" تبریز کا دھیما پن ان کے اشتعال کو کم نہیں کر پایا تھا۔

"رانیہ کی شادی والی بات تم نے ہی شروع کی تھی۔ اب اگر تم راضی نہیں تھے اس سے شادی کرنے کو تو کیا کسی بھی ایرے غیرے اٹھائی گیرے سے اس کا نکاح کر دو گے؟ وہ دو کوڑی کا ملازم میرے خاندان سے رشتہ جوڑے گا"۔ ان کا پورا جسم غصے سے کانپ رہا تھا۔ ماتھے کی رگیں پھولی ہوئی تھیں۔ کمرے میں چکر لگاتے وہ اب زور زور سے سانس لے رہے تھے۔ ایکدم وہ بیڈ پہ بیٹھ گئے۔ تبریز بھاگ کر نا کے پاس آیا اور ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھا پر انہوں نے نفرت سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"دور رہو مجھ سے۔۔۔ سردار محسن علی ابھی اتنا کمزور نہیں ہوا کہ اسے تم جیسے آستین کے سانپ کا سہارا لینا پڑے"۔ اس حالت میں بھی وہ پھنکارے تھے۔

"میں جانتا ہوں بابا اس وقت آپ کو مجھ سے شدید نفرت ہو رہی ہے۔ آپ کہیں گے تو میں آج ہی یہ گھر چھوڑ کر بھی چلا جاؤں گا۔ لیکن بابا خدا کے لئے اب یہ ظلم بند کر دیں۔ شائد اسی طرح ان گناہوں کا ازالہ ہو جائے"۔ کیا ان کے لالچ کی کوئی حد بھی تھی۔ پہلے رانیہ، پھر صلہ۔۔۔۔۔ جانے ابھی اور کتنے لوگوں کی آہوں کا بوجھ تھا جو وہ اپنے سر پہ لادے پھر رہے تھے۔ انسان بھول جاتا ہے کہ اس دنیا سے جاتے وقت اپنے نامہِ اعمال کے سوا کچھ بھی زادِ راہ نہیں ہوتا تو دو گز زمین ہی بس اس کی ملکیت رہ جاتی ہے۔

چند روز پہلے ہی تبریز کو فلک شیر کی اصل حقیقت معلوم ہوئی تھی۔ وہ اس کا دوست تھا شائد اسی لئے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کی خاطر اس نے رانیہ سے شادی والی بات اسے بتائی تھی۔ جواب میں فلک شیر کے چہرے کا رنگ بدلا تھا۔۔۔ آنکھوں کی چمک مایوسی مین بدل گئی تھی اور پھر اس نے دھیمے انداز میں ملازمت چھوڑ کر واپس اپنی زمینوں پر جانے کی بات کی تھی۔ تبریز کو شدید دھچکا لگا تھا۔

"تم ابھی کے ابھی اس نکاح کو رکواؤ گے ورنہ پھر انجام کی شکایت مجھ سے مت کرنا"۔ وہ باقاعدہ اسے دھمکی دے رہے تھے۔ ان کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا تبریز اس کام کے لئے فلک شیر جیسا مہرہ چنے گا۔ خود تبریز بھی چند روز پہلے تک کہاں جانتا تھا کہ فلک شیر، رانیہ کو پسند کرتا ہے اور اس کی خاطر یہ غلامی کا طوق گلے میں ڈالے با خوشی وقت گزار رہا ہے۔ فلک شیر کی باتوں سے اس کا ماتھا ٹھنکا تھا اور پھر جب اس نے ٹوہ لگائی تو بات کھل کر

سامنے آگئی۔ وہ رانیہ سے پوچھے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا تھا سو اس نے اس کی مرضی بھی پوچھ لی۔ پہلے تو وہ کچھ سمجھ نا پائی پر جب تبریز نے اسے سردار صاحب کے دماغ میں پلتی سوچ کے متعلق بتایا تو وہ مان گئی تھی۔ تبریز سے شادی والی بات اس کے کانوں تک بھی پہنچی تھی۔۔۔۔۔ وہ خود بھی یہ رشتہ نہیں چاہتی تھی پر اس گھر میں کسی کو اس کی مرضی جاننے کی پرواہ تھی بھی کہاں۔ رانیہ جانتی تھی تبریز راضی نہیں مگر ایسا سردار صاحب فقط اس کی جائیداد کے لئے کرنا چاہتے ہیں یہ جان کر اسے تکلیف ہوئی تھی۔ اس کے ماں باپ نہیں تھے۔ وہ محسن علی کو اپنے باپ سے بڑھ کر سمجھتی تھی۔ اسے امید نا تھی وہ اس کے ساتھ اتنی زیادتی کر سکتے ہیں۔ ان کی خوشی کی خاطر وہ اپنی تمام عمر اس گھر میں زندہ لاش بن کر گزار سکتی تھی پر وہ اسے بیٹی بھی تو سمجھتے۔ اس نے تبریز کو سردار صاحب کے خلاف جانے سے روکا تھا پر تبریز نے اسے سمجھایا کہ ابھی وقت آچکا ہے ہر غلطی کو درست کرنے کا۔ فلک شیر کو اس کی چاہ ہے نا کہ اس کے مال و دولت کی اور وہ اس کے خلوص کی قدر کرے۔ رانیہ نے ہاں کر دی تھی اور آج سردار محسن علی کے طے کردہ وقت پر رانیہ کا نکاح تبریز کی بجائے فلک شیر سے ہو رہا تھا۔ تبریز نے عین موقع پر یہ انکشاف کر کے سردار محسن علی کے پیروں تلے سے زمین نکال دی تھی۔ وہ غصے میں آگ بگولا وہاں سے چلے آئے تھے اور اب تنبیہی انداز میں تبریز کو سنگین نتائج کی دھمکی دے رہے تھے۔ تبریز نے ان کی بات نہیں مانی تھی اور بناء جواب دیئے کمرے سے باہر آگیا تھا۔ ہال میں موجود ہر شخص کے چہرے پہ پریشانی تھی۔ فلک شیر نے اس کو دیکھا۔ اس نے نکاح خواں کو روک رکھا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا اس کی وجہ سے تبریز پہ عتاب آئے۔ تبریز نے آنکھوں ہی آنکھوں میں فلک شیر کو تسلی دی۔ اگلے چند منٹوں میں ایجاب و قبول ہو چکا تھا۔ فلک شیر ابھی رانیہ کو لے کر گھر سے نکلا تھا۔ ان کے ساتھ تبریز بھی تھا۔ شائد وہ ان دونوں کو سردار صاحب کی دسترس سے دور کسی

محفوظ مقام پہ بھیجنا چاہتا تھا اسی لئے ان کو چھوڑنے اسٹیشن گیا تھا کہ کہیں محسن علی غصے میں آکر کوئی ایسی حرکت نا کر بیٹھیں جس کا ازالہ نا ممکن ہو۔

پہلے صلہ کو اس کے گھر بھیجنا اور اب رانیہ کی فلک شیر سے شادی۔۔۔۔۔ تبریز ان کی کھینچی لکیریں مٹاتا جا رہا تھا۔ وقت کا پلڑا دھیرے دھیرے مخالف سمت جھکنے لگا تھا۔ سردار محسن علی کے اختیارات کو ان کے اپنے ہی گھر میں چیلنج کیا جا رہا تھا۔ وہ بوڑھے ہوئے تھے مگر کمزور نہیں۔ اس علاقے میں ان کی طاقت، ان کا سیاسی اثر و رسوخ پہلے سے زیادہ بڑھ چکا تھا لیکن اب بازی پلٹ رہی تھی۔ کل تک ان کے سامنے گردن جھکائے ہاتھ باندھنے والے اب ان کی برابری پہ آنے لگے تھے۔ تبریز کی یہ حرکت ان کی روح بھسم کر رہی تھی۔ انہیں کسی طور سکون نہیں آ رہا تھا کہ سکون تو اس بغاوت نے غارت کر دیا تھا۔ آج اس نے فلک شیر اور رانیہ کے لئے آواز اٹھاتے فیصلہ لیا تھا کل وہ صلہ کے حق میں بھی بولے گا۔ تبریز پہ ان کے الفاظ بے اثر ہو چکے تھے۔ اگر یہ سب ہو گیا تو محسن علی کو سر کے بل گرنے سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔ اب وقت آ پہنچا تھا کہ سردار محسن علی اسے اپنا اصل روپ دکھائیں۔ ان کے فیصلے کے خلاف جانے والوں کا کیا حشر ہوتا ہے اور یہ کہ کل اختیارات فقط انہی کو حاصل ہیں یہ اب تبریز کو باور کرانا نہایت ضروری تھا۔

بہت سوچ سمجھ کر انہوں نے دوٹوک فیصلہ لیتے اپنا ہاتھ بیڈ سائیڈ ٹیبل پہ پڑے فون کی طرف بڑھایا تھا۔ سانپ کا سر کچلنے کا وقت آن پہنچا تھا۔

☆☆☆

صلہ نے جب گھر میں قدم رکھا تو شام کے سائے گہرے ہو چکے تھے۔ گھر کے در و دیوار پہ گہرا سکوت چھایا ہوا تھا۔ ایک عجیب سی ویرانی تھی جو اس سے پہلے کبھی بھی اس نے یہاں محسوس نہیں کی تھی گو خود اس کے اپنے اندر ہر پل وحشت کا بسیرا تھا پر اسے کبھی اس گھر کے اندر اتنا اندھیرا نہیں دکھا تھا۔ لاؤنج کی سب لائٹیں بند تھیں۔ اس نے آگے بڑھ کر سوئچ بورڈ پہ ہاتھ مارا اور کمرہ روشن ہو گیا۔ ایسا لگتا تھا گھر میں اس وقت کوئی بھی نہیں ہے پر ملازم بھی تو کوئی نہیں تھا۔ آخر سب کہاں جا سکتے تھے۔ اس نے قدم اوپر کی منزل کی طرف بڑھائے پر اچانک اسے قدسیہ اور تبریز کی بات یاد آئی۔ آج تو تبریز اور رانیہ کا نکاح تھا۔ آج کے بعد زندگی اس پر اور بھی تنگ ہونے والی تھی۔ آج کے بعد یہ مان بھی رخصت ہونے کو تھا کہ کوئی حق نا ہو کر بھی اس کا شوہر صرف اس کا ہے۔ سر جھٹکتے وہ واپس سرونٹ کوارٹر کی طرف پلٹ گئی کہ تبریز کے کمرے میں اس کا مقام عارضی تھا اور اب وہی چھوٹا سا کمرہ صلہ کا مستقل ٹھکانہ تھا۔ سر جھکائے وہ پچھلے احاطے میں آ گئی۔ سردی کی وجہ سے یہاں اس وقت کوئی بھی نہیں تھا۔ سب دروازے بند تھے البتہ ایک زرد بلب کی مدھم سی روشنی وہاں کے اندھیرے میں دراڑ ڈالتی تھی۔ صلہ نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھولا۔ وہی سیاہ دیواریں، وہی تنہائی۔۔۔۔ روشنی تو اس وقت تبریز کے کمرے میں ہو گی۔ رانیہ کے روپ کی روشنی۔۔۔۔۔ اس کا ذہن بس اسی ایک نقطے پہ جا اٹکا تھا۔ دروازہ لاک کر کے وہ اپنے بستر پہ بیٹھ گئی۔ درد کا شدید احساس تھا جو اس وقت آنسو بن کر اس کی آنکھوں سے بہہ نکلا تھا۔ وہ چند روز جو تبریز کے کمرے میں گزرے۔۔۔ اس کا صلہ کی طرف جھکاؤ، اس کی وہ مہربانیاں۔۔۔ ایک ایک پل صلہ کو یاد آنے لگا تھا۔ گر راستے جدا تھے تو پھر اس کی طرف کیوں آیا تھا وہ؟ تکیے میں منہ دیئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی کہ ایک بار پھر یہ رونا ہی اس کا مقدر ٹھہرا تھا۔

☆☆☆

"جس نے کسی دوسرے کی ذرا سی زمین بھی ناحق لے لی اس کو روزِ قیامت ساتویں زمین تک دھنسایا جائے گا"۔(بخاری شریف)

چوبیس گھنٹے سے وہ بستر پہ بے سدھ پڑے تھے۔ان کی آنکھوں اور دماغ کے سوا جسم کا ہر حصہ بے حرکت ہو چکا تھا۔رانیہ اور فلک شیر کو قتل کروانے کا فیصلہ کرتے ہی سردار محسن علی نے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔غصہ اور اہانت سے اپنے سن ہوتے اعصاب کے ساتھ انہوں نے نمبر ملایا پر اچانک ریسیور ان کے ہاتھ سے گر کر دور چلا گیا تھا۔وہ بری طرح لڑکھڑائے اور اپنی پوری کوشش کے باوجود خود کو گرنے سے نا بچا پائے۔گھر کے ملازم نے انہیں سنبھالا اور پھر تبریز اور ڈاکٹر کو ایک ساتھ کال کر کے بلایا تھا۔رانیہ اس وقت فلک شیر کے ساتھ جا چکی تھی۔تبریز بھاگم بھاگ گھر پہنچا اور ڈاکٹر کے ساتھ انہیں ہاسپٹال لے آیا۔سردار محسن علی کو شدید اعصابی تناؤ اور خطرناک حد تک بلڈ پریشر شوٹ کر جانے کے باعث فالج کا شدید ترین اٹیک ہوا تھا جس کی وجہ سے ان کے جسم کا آدھے سے زیادہ حصہ بے جان ہو گیا تھا۔عمر کے اس حصے میں ریکوری آسان نا تھی لہذا ڈاکٹروں نے تبریز کو کوئی امید نہیں دلائی تھی۔اس وقت سے وہ مسلسل ان کے پاس ہی تھا۔تبریز کو ان کی بے بسی تکلیف دے رہی تھی کہ بہر حال اولاد کی والدین سے محبت غیر مشروط ہوتی ہے پھر بھلے وہ اس سے بڑھ کر برائی کے مرتکب کیوں نا ہوں لیکن آخر کب تک ان کی زیادتیوں کو سہہ کر وہ سب خاموشی سے اس جہنم زدہ زندگی کو گزارتے رہیں۔اب وقت آن پہنچا

تھا انہیں ان کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا ہے۔ زندگی میں کی گئی ان تمام غلطیوں کا ازالہ کرنا ہے یا پھر وہ ہو گا جو تبریز کرنا چاہتا ہے۔ حق جب مانگنے پر نہیں ملتا تو پھر مجبوراً چھیننا پڑتا ہے۔

مجھے معاف کر دیجئے گا بابا لیکن میں نہیں چاہتا تھا کہ روزِ حشر میرا باپ غاصب کہلائے۔ "سردار صاحب نہیں" جانتے تھے، جو جھکنا نہیں جانتے وہ ٹوٹ جایا کرتے ہیں۔ بہت دیر ان کے پاس بیٹھا وہ ان سے معافی مانگتا رہا۔ انہیں چند روز بعد ڈسچارج کیا جانا تھا کہ ان کی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں تھا اور اس سے زیادہ ڈاکٹر ان کے لئے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

اپنی بقیہ سانسیں انہیں اسی حالت میں بستر پر گزارنی تھیں۔

☆☆☆

دروازہ بری طرح پیٹا جا رہا تھا۔ کوئی اونچی آواز میں اس کا نام پکار رہا تھا۔ اس نے بمشکل آنکھیں کھولیں پر ذہن اب تک گہری کھائی میں تھا۔ وہ یہاں سے نکلنا نہیں چاہتی تھی اسی لئے ایک بار پھر آنکھیں موند لیں۔ دروازہ اب بھی بج رہا تھا۔ آوازیں اب بھی آ رہی تھیں۔ پر وہ کچھ بھی سننا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اب کچھ دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ اچانک کچھ گرنے کی آواز دھماکے کی طرح گونجی تھی۔ لکڑی کا بوسیدہ دروازہ توڑا گیا۔ اس بار صلہ نے آنکھیں کھولنا چاہیں، کوئی اندر آیا تھا پر کون؟؟؟؟ اس کا ذہن ایک بار پھر کسی تاریک سرنگ میں سفر کرنے لگا تھا۔

☆☆☆

جانے کتنے زمانوں بعد اس نے آنکھیں کھولی تھیں۔ کتنی ساعتوں بعد اسے ہوش آیا تھا خود اسے بھی اس بات کا اندازہ نہیں تھا۔ یاد تھا تو بس اتنا وہ اپنے کمرے میں تھی جب اپنے حال پہ روتے روتے اور مستقبل کے خوف کے زیرِ اثر اسے شدید کپکپی محسوس ہوئی تھی۔ جسم آگ سا تپنے لگا تھا۔ گھر میں کوئی اس کی واپسی کے متعلق نہیں جانتا تھا سوائے چوکیدار کے جس نے اسے مین گیٹ سے داخل ہوتے دیکھا تھا۔ سب ملازم سردار صاحب کی وجہ سے پریشان تھے تو خود تبریز کون سا گھر پہ تھا۔ لیکن جب وہ گھر آیا تو سیدھا اپنے کمرے میں گیا۔ تھکن سے خود اس کا اپنا برا حال تھا مگر صلہ کو کمرے میں ناپا کر اس کا ماتھا ٹھنکا تھا۔ قدسیہ سے پوچھا تو اس نے بھی اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ تبریز کو شدید حیرت ہوئی تھی۔ تو کیا صلہ واپس نہیں آئی؟؟؟

اپنے شبے کی تصدیق کرنے وہ اس کے کوارٹر کی طرف گیا۔ دروازہ اندر سے لاک تھا۔ بہت بار دستک کے باوجود جب نا کھلا تو مجبوراً توڑنا پڑا۔ اندر وہ بخار میں پھنکتی بے ہوش پڑی تھی۔ ملازم بند دروازہ دیکھ کر یہی سمجھتے رہے اندر کوئی نہیں ہے کیونکہ صلہ تو کئی روز سے وہاں تھی ہی نہیں۔

آنکھیں اب بھی بوجھل ہو رہی تھیں کہ پلکیں بمشکل اٹھائے اس نے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ وہی کمرہ۔۔۔ وہی بستر۔۔۔ پر وہ خود کہاں تھا۔ صلہ نے دائیں طرف پڑے خالی صوفے کو دیکھتے سوچا اور پھر سستی سے بائیں طرف کروٹ بدلی۔ وہ فریز ہو گئی تھی۔ آنکھوں پہ بازو ٹکائے تبریز اس سے کچھ فاصلے پہ لیٹا تھا۔ شائد وہ سو رہا تھا۔ صلہ نے کہنی کے بل اٹھنا چاہا۔ گو کوئی آہٹ نا تھی پر شائد وہ گہری نیند میں نا تھا اسی لئے بازو ہٹائے چونک کر صلہ کو دیکھا۔

"میں نے تمہیں کہا تھا نا اب تم وہاں نہیں بلکہ یہاں رہو گی۔۔۔میرے کمرے میں" ۔کروٹ کے بل لیٹے اس نے غصے سے کہا تھا۔اس کی آواز میں اب بھی نیند کا خمار تھا۔وہ جو کہنی تکیے پہ ٹکائے اٹھنا چاہتی تھی اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر وہیں کی وہیں رہ گئی۔تبریز کے چہرے پر نظر آتی ناگواری کی جھلک چھپائے نا چھپتی تھی۔

"پر یہ کمرہ تو آپ کی بیوی کا ہے"۔خود اپنی آواز اسے کہیں دور سے سنائی دی تھی۔

کیسے کہہ دوں کے مجھے چھوڑ دیا ہے اس نے

بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی

"اسی لئے تو تمہیں یہاں رکنے کو کہا تھا۔" وہ زچ ہوا تھا۔کب سے تو جاگ رہا تھا اس پہ اسپتال اور بابا کی طبیعت کو لے کر پریشانی الگ۔۔۔باقی کی کسر صلہ نے پوری کر دی تھی۔ذہن شدید بوجھل تھا۔

"تو پھر رانیہ کہاں رہے ں گی؟" معصومیت سے کہتے اس نے تبریز کی طرف دیکھنے سے گریز کیا تھا۔

"رانیہ میرے کمرے میں کیوں رہے گی صلہ وہ تو۔۔۔" بے ساختہ کہتے وہ ایکدم رکا۔صلہ کا مسئلہ اسے اب سمجھ آیا تھا۔

"افففف میرے اللہ۔۔۔احمق لڑکی کچھ بھی طے کرنے سے پہلے اس بات کی تصدیق تو کر لیتی"۔تبریز کو صلہ کا رویہ اب سمجھ آیا تھا۔جانے سے پہلے اس نے قدسیہ اور اس کی گفتگو سنی تھی اور اسی کے مطابق نتیجہ نکالا تھا۔تبریز کو بھی اسے سچائی بتانے کا وقت نہیں ملا تھا۔

"پرسوں نکاح تھا نا آپ دونوں کا۔" صلہ انگلیاں مروڑتی دھیمی آواز میں بولی۔ وہ دونوں اب آمنے سامنے بیٹھے تھے۔

"ایک بیوی سنبھالی نہیں گئی اور دوسری شادی کرلوں۔" استہزائیہ ہنسی ہنستے اس نے صلہ کو دیکھا۔ اس کے برعکس وہ اب بھی سنجیدہ اور ڈری ہوئی تھی پر وہ بے سکونی جو اتنے دن سے طاری تھی اس پل تبریز کے اس انکشاف کے بعد رخصت ہوگئی تھی۔ تبریز نے اسے اول تا آخر سب کہہ سنایا تھا۔ رانیہ اور فلک شیر کی شادی سے لے کر سردار محسن علی کی موجودہ حالت تک۔

"ہوسکے تو مجھے معاف کردینا، میری لاپرواہی کے سبب ایک طویل عرصہ بڑی تکلیف میں گزارا ہے تم نے۔ بابا کے غلط فیصلوں نے ایک ساتھ بہت سے لوگوں کو اذیت پہنچائی پر قصور میرا بھی کم نہیں۔ لیکن اب میں اپنی غلطی کا ازالہ کروں گا۔" صلہ نے اس کے سنجیدہ اور پرسوچ چہرے کو دیکھا۔

"تمہیں یہ رشتہ کسی جبر کے تحت کئے فیصلے کی بناء پر گزارنے کی ضرورت نہیں۔ میں پورے عزت اور مان سے تمہارا حق تمہیں دے کر اپنی زندگی اپنی مرضی سے شروع کرنے کا اختیار دیتا ہوں۔ تم جانا چاہو تو۔۔۔۔۔" وہ بولتے بولتے رکا تھا۔ صلہ نے بے یقینی سے دیکھا۔ اچانک اس کا دل نکل کر مٹھی میں آگیا تھا۔ وہ اسے آپشن دے رہا۔ زندگی سے نکل جانے کی آپشن۔ کیا ستم اس رشتے کے آغاز میں کسی نے اختیار دیا نا پوچھا اور آج اس کا شوہر اس کی مرضی سے اسے چھوڑنے کا اختیار دے رہا تھا۔

"اتنے سالوں سے یہاں ہوں۔ واپسی کا ہر در بند تھا تو پر کٹے پرندے کی مانند آزادی کا تصور اور چاہ بھی ختم ہو گئی۔ اب سوچتی ہوں کہاں جاؤں گی"۔ کچھ دیر سوچ کر لبوں پہ ابھرتی زخمی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے اپنی حالت کا تجزیہ کیا۔ کیا اس گھر میں واپس جا سکتی تھی جہاں اب کچھ بھی اپنا نہیں تھا۔ میکے کا وہ مان کہ کوئی ہے جو پیچھے ان کی راہ تکتا ہو گا یا پھر ان کی تکلیف پہ دوڑا چلا آئے گا۔۔۔۔ یہ احساس تو کبھی اس کے پاس نہیں تھا پر اب اتنے سالوں بعد ماں باپ سے مل کر، اس گھر میں واپس جا کر بھی اسے وہاں لوٹنے کی چاہت نہیں ہوئی تھی۔

"تو مت جاؤ صلہ۔۔۔۔ مجھے ایک موقع دو ہمارے رشتے کو سدھارنے کا۔ اس رشتے سے آزادی کی چاہ گر تم میں باقی نہیں تو یقین مانو میرا وجود بھی لاشعوری طور پہ اس تعلق میں جکڑا ہے۔ چاہے ان چاہے میں کبھی خود کو تم سے جدا نہیں کر پایا ورنہ گئے دنوں میں بارہا سوچا کب تک یوں تنہا زندگی گزاروں گا۔۔۔۔ جب بھی شادی کے متعلق خیال آیا تمہارا تصور میری سوچ پہ غالب آ گیا۔" تبریز نے آگے بڑھ کر اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ صلہ نے پہلی بار اسے اتنا جذباتی ہوتے دیکھا تھا کہ اس کے ہاتھوں کی تپش روح تک سفر کر رہی تھی۔ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ اس کے دل پہ دستک دے رہا تھا۔

"جب بھی کبھی میرا دل دکھتا تھا، مجھے تکلیف ہوتی۔۔۔ میں دل ہی دل آپ سے شکوہ کرتی اور ہر بار مجھے اپنے اندر نفرت کا احساس ابلتا محسوس ہوتا کہ میری ان تکالیف کا سرا آپ کی ذات سے جڑا تھا۔ آپ کو ٹھیک سے دیکھا تھا نا ہی کبھی بات ہوئی تھی بس قدسیہ اماں ہی اکثر

آپ کے متعلق بتاتی تھیں۔ لیکن میرے ذہن کے پردوں پہ ابھرتا خاکہ آپ کی شخصیت اور ان کی باتوں سے الگ تھا"۔ یہ وہ باتیں تھیں جو تنہائی میں وہ خود سے کیا کرتی تھی۔ ہر بار اپنی تکلیف پہ آنسو بہاتے اسے اپنے گھر والوں کے بعد اس شخص سے شکایت ہوتی جس نے اسے اس بے معنی بندھن میں باندھا تھا۔ وہ نبھانا چاہتا تھا نا چھوڑنا اور صلہ کا وجود ہوا میں معلق تھا جس کے پاس کھڑے ہونے کو زمین تھی نا ہی سر پہ چھت کا آسرا۔

"مجھ سے نفرت مت کرنا صلہ کہ میں خود محبت کے لئے ترس رہا ہوں"۔ بے بسی التجا بن کر زباں پہ آگئی تھی۔ تبریز نے اس کے ہاتھ کی پشت کو لبوں سے لگاتے کہا تھا۔

"جس دن آپ نے پہلی بار میرے زخموں پہ مرہم رکھا میں ماضی کی ہر تکلیف بھول گئی۔ دل نے سوچا آپ کا ساتھ ہو تو اس جہنم میں سو بار جلنا قبول ہے"۔ صلہ کے لئے وہ چند دن ہی پوری زندگی سے بڑھ کر تھے۔ لاکھ کوشش کے باوجود دل اس کی طرف مائل تھا اور ساتھ ہی یہ خوف بھی کہ جانے کب وہ راستہ بدل لے۔ رانیہ سے شادی کی تلوار تو اسی رات سے سر پہ لٹک رہی تھی۔

"اوّل تو میرے ہوتے ایسی نوبت نہیں آئے گی اور اگر تکلیف کا کوئی پل آیا بھی تو دونوں ساتھ مل کر اسے گزاریں گے۔ مجھ پہ یقین رکھنا صلہ"۔

"یہ دل کہتا ہے آپ پہ آنکھیں بند کر کے یقین کر لوں"۔ تبریز نے آگے بڑھ کر اس کی بند آنکھوں پہ اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔

"بابا کو معاف کر دینا صلہ۔ آنے والے دنوں میں انہیں میری اشد ضرورت ہے۔ یہ گھر میں نے رانیہ کو دے دیا ہے۔ ہم شہر چلے جائیں گے بابا کے ساتھ۔ وہاں ان کا علاج بہتر ہو سکتا ہے۔ پتا نہیں کتنا عرصہ انہیں اس اذیت ناک حالت سے گزرنا پڑے۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں"۔ صلہ نے نفی میں سر ہلایا۔ خوشی دولت جائیداد اور گھروں کی محتاج نہیں، یہ دل کا سکون ہوتا ہے جو جھونپڑی میں بھی حاصل ہو سکتا ہے گر آپس میں محبت ہو۔ پرواہ ہو۔ ان دونوں کے درمیان محبت نا سہی پر نکاح کا مضبوط بندھن تھا۔ رشتے کی سب سے خوبصورت ڈور میں بندھے اب انہیں اس تعلق کو بھی حسین بنانا تھا۔

"آپ فکر نا کریں۔ میں سب کو معاف کر چکی ہوں اور آپ کی ہر پریشانی میری پریشانی ہے۔ آپ اکیلے نہیں ہیں"۔ وہ عورت تھی صبر اور شکر کی مٹی سے تخلیق کی گئی، محبت کی بیل سی پروان چڑھی، ہر زیادتی پہ درگزر کا حوصلہ رکھنے والی۔ اس سا بہادر تو شائد وہ بھی نہیں تھا۔

بے شک اچھا جیون ساتھی کسی نعمت سے کم نہیں اور صلہ کی صورت اسے انجانے میں ہی سہی لیکن ایک بہترین ہم سفر ملا تھا جس کے ساتھ ماضی میں ہوئی ہر زیادتی کا ازالہ اسے اپنے بہترین سلوک اور محبت سے کرنا تھا۔

تبریز نے اس کا سر اپنے سینے پہ ٹکائے خود کو پر سکون محسوس کیا۔ صلہ کو لگا جیسے صدیوں کی تھکن اس ایک پل میں رخصت ہوئی تھی۔

ختم شد